خطبہ شیطانی

اور

تلقین رحمانی

ایک دلچسپ، سبق آموز، اخلاقی
منظوم افسانہ

از

عبدالحمید فرید ایڈووکیٹ کراچی

مع

تعارف از مولانا عبدالمجید سالک مرحوم

تبصرہ از رفیق خاور صاحب

خطبۂ شیطانی

اور

تلقین رحمانی

حصہ اوّل اور دوم

ایک دلچسپ سبق آموز اخلاقی

منظوم افسانہ

از

عبدالحمید فرید (ایڈووکیٹ کراچی)

انتساب

میری زوجۂ مرحومہ

مسعودہ خاتون

کے

نام

جس کے فراق میں یہ افسانہ لکھا گیا

عبدالحمید فرید

پبلشر

رضوان احمد

۵- خان مینشن، آرام باغ، رام تلاؤ روڈ
کراچی پاکستان

طباعت — انٹرنیشنل پریس کراچی

کتابت — عالم علی - فیض الکتابت

قیمت — چار روپے پچاس پیسے

ترتیب

تعارف

مولانا عبدالمجید سالک (مرحوم)

یہ تعارف مولانا مرحوم نے اس زمانے میں لکھا تھا جب وہ کراچی میں مقیم تھے اور ان کا تعلق ریڈیو پاکستان کراچی سے تھا۔

علامہ اقبالؒ اکثر فرمایا کرتے تھے، کہ آجکل کے زمانے میں اسلام اور مسلمانوں پر ایسا وقت آن پڑا ہے جس کی مثال پوری تاریخِ اسلام میں نہیں ملتی۔ دولت و قوت جو کسی قوم کی مادی عظمت کے سامان ہیں، آج مسلمانوں کو حاصل نہیں۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ فکر و عمل صراطِ مستقیم سے ہٹ کر، راستہ بھول گئے ہیں۔ اس لئے جن مسلمان افراد کو اللہ تعالیٰ نے بعض خاص ودیعتوں سے مالا مال کیا ہے، ان کا فرض ہے کہ ان ودیعتوں کو صرف اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے وقف کر دیں، تاکہ ان کے فکر و عمل کا صحیح راستہ معین ہو جائے۔ علامہ ممدوح اپنے متعلق کہا کرتے تھے کہ انگلستان جانے سے پہلے، میں بھی آفاقی شاعری اور آفاقی فلسفے کی فضا میں پرواز کرنا، مقصدِ زندگی سمجھتا تھا۔ لیکن جب مغرب سے واپس آتے ہوئے، میں نے اسلامی ملکوں کی زندگی اور ان کے اسالیبِ فکر و عمل پر غائر

نظر ڈالی، تو میں نے اپنے دل میں یہی فیصلہ کیا کہ اپنی ذہنی قوتوں کو،
زندگی بھر مسلمانوں ہی کی خدمت میں صرف کروں گا۔ چنانچہ علامہ
نے اس فیصلے پر عمل کر کے، صرف یہی نہیں کہ مسلمانانِ عالم کی
فکری تربیت فرمائی، بلکہ مسلمان اُدبا و شعراء کے لئے بھی ایک
نہایت روشن مثال قائم کردی۔

اب دنیا کے تقریباً تمام نقاد، اس پر متفق ہو چکے ہیں، کہ ادب
اور فن زندگی کے خادم ہیں۔ اور وہی ادب ادبِ عالیہ کہلانے کا
مستحق ہے، جو زندگی کو کسی نہ کسی پہلو سے بہتر، بلند تر، اور
روشن تر بنانے میں مدد دے۔ جس حالت میں سیاست،
مذہب، تجارت، صنعت، غرض انسان کی تمام فعالیتیں محض
زندگی کو بہتر بنانے کے نصب العین سے مصروفِ کار ہیں،
تو "ادب برائے ادب" کا نعرہ بالکل بے معنی ہے۔ بلکہ اس سے
ادب کی توہین ہوتی ہے۔ جو شخص فکرِ انسانی کے حسن اور اس کے
جمالِ بیان کو بے مقصد بتاتا ہے، وہ یقیناً انسان کی اس
عظیم الشان ودیعت کا استخفاف کرتا ہے۔

فرید صاحب کی شاعری کا مقصد بھی محض یہ ہے، کہ حسنِ فکر
اور جمالِ بیان سے کام لے کر، انسانی زندگی کو پاکیزہ تر بنایا جائے۔
اور ان اخلاقِ عالیہ کی تبلیغ کی جائے، جو اسلام نے سکھائے ہیں،
اور جو کسی ملک یا قوم یا گروہ سے مخصوص نہیں ہیں۔ بلکہ آفاقی
اور انسانی وسعت رکھتے ہیں۔ فرید نے اس نظم میں قصّے کا سہارا محض
اس لئے لیا ہے کہ پڑھنے والوں کی دلچسپی کو قائم رکھیں، اور شعر محض

وعظ بن کر نہ رہ جائے۔ قارئین ملاحظہ فرمائیں گے، کہ اس نظم
میں مقصود قصّہ نہیں بلکہ عبرت اور موعظت ہے: اور یہ اسلوبِ
بیان بھی قرآنی اور اسلامی ہے۔ کیونکہ قصص و امثال بیان کر کے،
ان سے قلوبِ انسانی کو متاثر کرنا قرآنِ حکیم کی تقلید ہے۔ اور ہمارے
اکابر شعراء، مثلاً رومی و سعدی نے اس اسلوب کو درجۂ کمال تک
پہنچا دیا ہے۔

اگر اردو اکابر شعراء کی تقلید فرید کے پیش نظر ہوتی، تو وہ مثنوی
لکھتے۔ لیکن انھوں نے اس پامال صنفِ سخن کو اختیار کرنا مناسب
نہیں سمجھا، جس کی دلآویزی بھی امتدادِ زمانہ سے ختم ہو چکی ہے۔
اور جس کے موضوعات کی پستی، اور اندازِ بیان کے ابتذال نے
بھی، اس کو رسوائے عالم کر رکھا ہے۔ فرید نے نسبتاً لمبی بحر
(متقارب) اختیار کی ہے۔ جس کا آہنگ بھی مؤثر ہے، اور جس
میں گنجائشِ بیان بھی زیادہ ہے۔

ہم لوگ شاعری میں مشقِ سخن کو بڑی اہمیت دیتے چلے
آئے ہیں۔ اور ہمارے اکثر نقادوں کے نزدیک، یہ امر مسلّم ہے،
کہ شاعر کو اپنی تخلیقات میں کوئی معزز مقام اس وقت تک حاصل
نہیں ہو سکتا، جب تک وہ سالہا سال تک شعر کہنے کی مشق جاری
نہ رکھے۔ لیکن فرید جیسے شاعر نے، اس مفروضہ کو باطل قرار
دے دیا ہے۔ "خطبۂ شیطانی اور تلقین رحمانی" سے پیشتر فرید
دنیائے سخن میں بالکل بے نشان تھے، اور انھیں کبھی اشعار لکھنے
کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ لیکن چونکہ ان میں شدّتِ احساس کا جوہر

موجود تھا، جو ہر شاعری کی جان ہے، اور اس کے علاوہ اُردو، فارسی، عربی، اور انگریزی شاعری کے مطالعہ کے رسیا تھے۔ اس لئے انھوں نے مشق کے بغیر، ایک ایسی نظم تخلیق کردی، جس کے اشعار کو پڑھ کر اور انکی بندشوں پر غور کرکے، کوئی شخص ان کی پختگیِ کلام کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یوں تو اس پوری نظم کا ہر حصّہ پاکیزہ احساسات کا آئینہ ہے، اور شاعر کی دردمندی، اس کا خلوص، اور اس کی صداقت ایک ایک مصرعے سے ہویدا ہے۔ لیکن آخری بند میں جس کمالِ فن اور جس خلوص سے اس نے اخلاقِ اسلامی کی تلقین کی ہے، اس سے سعید روحیں، متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گی۔

کتابوں کے دیباچوں میں اقتباسات نقل کرنا میرا طریقہ نہیں۔ اس کے علاوہ ایک اچھی کتاب کے معاملے میں، قوتِ انتخاب بھی معطل سی ہوجاتی ہے، کہ کونسا حصّہ نقل کیا جائے اور کونسا چھوڑ دیا جائے اس لئے میں نے اقتباس سے پرہیز کیا ہے۔ اور ہر قاری سے اس کا خواہاں ہوں، کہ وہ اس کتاب کو بالاستیعاب پڑھے۔ جب جاکر اسے اس کی ادبی اور افادی حیثیت کا صحیح اندازہ ہوسکے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ فرید صاحب اس کتاب کے بعد فکرِ شعر کا سلسلہ بند نہ کریں اور بہت جلد ہمیں یہ کہنے کا موقع دیں کہ ؎

نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اوّل

عبدالمجید سالک

کراچی ۲۲ فروری ۱۹۵۴ء

تبصرہ

رفیق خاور

اُردو میں منظوم داستانیں تو بہت لکھی گئی ہیں۔ ہماری قدیم مثنویوں کا موضوع زیادہ تر حسن و عشق کے قصّے کہانیاں ہی رہا ہے، جن میں سے اکثر مثنوی میر حسن اور "گلزارِ نسیم" کی طرح خارقِ عادت واقعات پر مشتمل ہیں۔ لیکن منظوم افسانے، جن کی مثال ہمیں کیٹس (KEATS) کی "لامعہ" (LAMIA)۔ "دی ایو آف سینٹ اگنیز" (THE EVE OF ST. AGNES) وغیرہ میں دکھائی دیتی ہے، بالکل نایاب ہیں۔ فرید صاحب کا یہ منظوم افسانہ شاید اس صنف کی پہلی مثال ہے اور اگر اس تمثیلی نوعیت کو پیش نظر رکھا جائے تو بلاشبہ اپنی قسم کا واحد افسانہ ہے، جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

پہلے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ افسانہ ہے بھی یا نہیں، کیونکہ اس میں واقعات کا کوئی ایسا سلسلہ یا پلاٹ کا تانا بانا نہیں، جس سے قصّہ

لہ میں نے یہ افسانہ ون ایکٹ پلے (ONE ACT PLAY) کی طرز کو پیش نظر رکھ کر لکھا، جس میں کوئی واقعات کا سلسلہ یا پلاٹ کا تانا بانا نہیں ہوا کرتا۔ لیکن خاور صاحب کا اعتراض صحیح ہے اس لئے کہ ون ایکٹ پلے ایک مختصر سا ڈرامہ ہوتا ہے اور یہ منظوم افسانہ ہے۔ فرید

یا کہانی کا انداز پیدا ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس نظم میں افسانہ کا عنصر برائے نام ہے۔ واقعات اس قدر مختصر اور سیدھے سادے ہیں، کہ ان سے بمشکل قصہ کی صورت پیدا ہوتی ہے، تاہم جو کچھ بیان کیا گیا ہے، وہ افسانہ ہی کے ذیل میں آتا ہے، اور ہمیں انگریزی کی ان منظومات کی یاد دلاتا ہے جو

MASQUE INTERLUDE, MORALITY

کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔ ملٹن جیسے نامور شاعر نے بھی بعض ایسی نظمیں لکھی ہیں، اگرچہ ان میں شاعری اور افسانہ دونوں کا عنصر کہیں کہیں زیادہ نمایاں ہے، یہ محض اتفاق ہے کہ ہمارے شاعر نے اپنے طبعی ذوق کی بنا پر، اس قسم کا تمثیلی افسانہ نظم کیا۔

نظم کو افسانہ کہنے سے یہ نہ سمجھئے کہ شاعر نے کسی باقاعدہ افسانہ نویس کی طرح بات سے بات ملائی ہے اور سلسلے سے سلسلہ جوڑا ہے۔ افسانہ کی لے بڑھاتے بڑھاتے شاعر کہیں کہیں خود بھی بول اٹھتا ہے اور بڑی بے تکلفی سے، گویا اس سے افسانے کی بڑھت میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوگا۔ وہ جانتا ہے کہ افسانہ محض دکھاوا ہے۔ دراصل افسانے کا ہیرو تو وہ خود ہی ہے۔ اس لئے وہ "جوان" کا ذکر کرتے کرتے خود بھی سامنے آجائے تو کوئی ہرج نہیں، لیکن اس قصہ میں اس قسم کی بے قاعدگیاں دیکھ کر ہم محظوظ ہوتے ہیں، کیونکہ فرید ایک پیشہ ور افسانہ نویس نہیں۔ وہ روایات سے بے خبر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اسے قواعد و ضوابط کی کوئی پروا نہیں، اس کی نمایاں خصوصیت اس کی معصومیت ہے اور

ہم اس سے وہ تمام باتیں قبول کر لیتے ہیں، جو ہم کھیل کے اصولوں کو جاننے والے جگادری کھلاڑی سے کبھی قبول نہیں کر سکتے، چنانچہ کس بے تکلفی سے وہ افسانہ پیش کرتے کرتے، اپنی ہی ایک غزل پیش کر دیتا ہے۔

شعری حیثیت سے بھی اس کا انداز کم دلچسپ نہیں۔ اردو میں منظوم افسانہ کس بحر یا صنف میں لکھا جائے اس مسئلہ کا فرید نے بہت اچھوتا حل پیش کیا ہے۔ وہ مثنوی کو اس کے لئے موزوں نہیں خیال کرتا۔ اس کی رائے میں بحر ہزج مثمن سالم اس کیلئے نہایت موزوں ہے اور وہ بھی یوں نہیں کہ اس کو "شاہنامۂ اسلام" کی طرح برتا جائے۔ اس طرح کلام میں خواہ مخواہ یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے بچنے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ نظم کو قطعہ[1] نما، ترکیب بند کی شکل دی جائے۔ ماہرین حیران ہوں گے کہ اس طرح ترکیب بندوں یا الگ الگ ٹکڑوں کو جوڑ کر افسانوی تسلسل کیسے پیدا کیا جائے گا، لیکن فرید اس سے اپنا مطلب پورا کر لیتا ہے، جس سے پھر ایک بڑی دلچسپ صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ نظم کے دوران "یک نواختی[2]" سے بچنے کے لئے کبھی کبھی بحر بھی بدل دیتا ہے۔ ان طریقوں سے اس کے خیال میں بلینک ورس BLANK VERSE کی ضرورت باقی نہیں رہتی!

فرید نے شاعری کے محاسن کا بھی ایک نرالا تصور قائم کیا ہے، جو روایتی تصور سے کچھ ایسا دور تو نہیں، لیکن جس اہتمام سے اس نے

---

[1] قطعہ نما، اس لئے کہ ہر بند کا مطلع یا قافیہ نہیں۔

[2] یک نواختی = MONOTONY

قوافی کے تواتر کا التزام کیا ہے وہ لطف سے خالی نہیں اور ہم اسکی
اس مسلسل کوشش کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ کرتے ہیں۔

الفاظ کے انتخاب اور تنوع کے معاملہ میں بھی فریدؔ کسی اور کے
نقشِ قدم پر چلنے کا قائل نہیں۔ وہ کسی کا مقلد نہیں۔ کیونکہ وہ سب
شاعروں سے الگ ہے۔ وہ کبھی ان کی محفل میں شریک نہیں ہوا، اور
نہ ان کا رنگ ڈھنگ، بول چال جانتا ہے۔ وہ تو صرف اپنی طبیعت
کا پیرو ہے، جیسے غیر رسمی شاعر عموماً ہوتے ہیں۔ مثلاً مقامی بولیوں،
پنجابی، سندھی، پشتو وغیرہ کے شعرا جن کے طور و طریق میں بے حد
بے تکلفی اور لچک پائی جاتی ہے۔ روایت کہیں بھی فریدؔ کے دامن
کو چھونے نہیں پاتی، کیونکہ وہ اس سے بالکل بے خبر اور بے پروا ہے
یہی وجہ ہے کہ اس کا ایک ہی اندازِ بیان ہے، جس میں اقبال کے
انداز کی سی چاشنی ہے۔ یہ بھی محض توارد ہے، جو دونوں شاعروں کے
فارسی ذوق سے پیدا ہوا ہے۔ بیان میں وسعت پیدا کرنے کیلئے
فریدؔ بے تکلف فارسی کے جدید الفاظ برتنے کا قائل ہے یہ درحقیقت
اس کے قیامِ ایران کا نتیجہ ہے، جس کو اس نے ایک نظریہ کی شکل عطا
کردی ہے۔ ہمارے اردوئے معلیٰ کے شیدائی اور ٹکسالی اردو کے
حامی اس قسم کے الفاظ کو حقیقتاً بڑی دلچسپی سے ملاحظہ فرمائیں گے۔
نباحِ تازی[۱]۔ وارونہ۔ غرام۔ اثم و عدوان۔ سر و صدا۔ یکراست۔
احوالِ لخت۔

بعض الفاظ اور تراکیب میں شاعر نے کافی سلیقے اور اپج سے
کام لیا ہے۔ مثلاً

۱؎ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

خطیبِ خودخواہ۔ سوزِ بروں۔ قیدیٔ بزم۔ ضمیرِ پرویز کارداں۔
عشقِ پارسا۔ جنونِ سبک بال۔ فسونِ آہی۔ ذوقِ شرنوازی۔ موبہ
بے مایۂ گیاہی۔ شیونِ شبانہ۔ گناہ شوئی۔ طبیعت نواز۔ کُلاہ بردار۔
آسماں رس۔ بادہ بو۔ جہلِ مبیں۔ عشقِ شکستہ پا۔ صید افگن۔ کلۂ آتش فشاں۔

فریدؔ محض شاعر ہی نہیں، زندہ دل بھی ہے۔ یہ اس میں اور دوسرے
شاعروں میں ایک اور فرق ہے۔ جو لے اس نے چھیڑی ہے، وہ بڑی
سنجیدہ ہے، لیکن یہ سنجیدگی اس کی چونچال طبیعت کو گہنا نہیں سکی۔
اس کی ظرافت بار بار گھرے بادلوں کے ہجوم سے چھن چھن کر آتی ہے
اور طبیعت پر شوخی کی ایک لہر چھوڑ جاتی ہے۔ دیکھئے ان اشعار میں
کس قدر چلبلاپن ہے، گویا ایک طبعاً ظریف انسان دل میں رہ رہ کر
گدگدی کر رہا ہے اور کہیں کہیں غضب کی چوٹ بھی کر جاتا ہے ؎

فیوض "سوزِ دروں" کے صدہا سُنا رہا تھا وہ سامعین کو
اور ان میں "سوزِ بروں" نہ پاکر غضب سے بیتاب ہو رہا تھا
محال دورانِ وعظ میں تھا کہ صدرِ محفل سے بھاگ جائے
وہ قیدیٔ بزم سر جھکائے نصیب کو اپنے رو رہا تھا
خدا ہی اُن شاعروں سے پوچھے، جنھوں نے ان بیوفا بتوں کو
زمیں کی خاشاک سے اُٹھا کر، مِلا دیا سطحِ آسماں سے

۱؎ نباحِ تازی = کتّے کا بھونکنا، تازی یعنی عربی گھوڑا یا شکاری کتا، نباح یعنی بھونکنا
وارونہ = اوندھا، اُلٹا — غرام = عشق، عربی میں غرام کا لفظ عشق کے معنی میں کثرت
سے بولا جاتا ہے — اِثم و عدواں = گناہ اور نافرمانی — سر و صدا = شور و غل فارسی
کا محاورہ ہے — یکراست = سیدھا، ٹھیٹھ — احوالِ لخت = کھلا احوال، لخت یعنی ننگا، برہنہ
فریدؔ

ہُوا ہو دِل کفر کا خزانہ، تو گائے جا دین کا ترانہ
یہ پیشہ گو ہے منافقانہ، پر اس سے ملتا ہے آب و دانہ

ہمیشہ باغات ہی سے زینت، رہی ہے دُنیائے رنگ و بو میں
اگر نہ ہوں باغباں جہاں میں، تو کیا رہے ان میں خوشنمائی
شکستہ دل، فیلسوف، شاعر، ولی، شقی، شیفتہ، مسافر
کلاہ بردار، دزد، تاجر، طبیب، قوال، کیمیائی
امیر مستِ شرابِ عشرت، فقیر وقفِ عذابِ حسرت
غرض کہ ہر کس بقدرِ ہمت، رہا ہے باغات کا فدائی

چوم لیں فرطِ احترام سے وہ
پیر و مرشد کی بادہ بُو پاپوش!

دیکھ نقاشِ سیہ مست کا نقشِ طاؤس!
اس میں ہُدہُد کا جو سر ہے، تو ابابیل کا پَر

اب ہم اس افسانے کے سب سے اہم پہلو کی طرف آتے ہیں۔ شاعر نے بالتفصیل بیان کیا ہے کہ اس نے یہ افسانہ کن حالات میں لکھا۔ اس نے اوائل عمر میں کبھی کبھار شعر کہے ہوں تو کہے ہوں، ورنہ نہ تو وہ پیشہ ور شاعر ہے اور نہ شعر کہنے کا شوقین۔ اس کی زندگی تو تمام تر ایک مصروف وکیل کی بے مصرف زندگی تھی، جس میں شعر و شاعری کا شوق ہو بھی تو مر جاتا ہے۔ ناگہاں اس کی نوجوان رفیقۂ حیات اسے

داغِ مفارقت دے گئی۔ جس سے اس پر جنوں کی سی حالت طاری ہو گئی۔ اس بحرانی حالت میں اس نے اپنا غم غلط کرنے کے لئے یہ افسانہ لکھنا شروع کیا، جس سے طبیعت رفتہ رفتہ بہلتی گئی اور شعر گوئی اس کے لئے نسخۂ شفا ثابت ہوئی۔ کیا اس سے بے اختیار ٹینی سن TENNYSON کا وہ گیت یاد نہیں آتا جس میں اس نے کہا ہے کہ "میرا دل دکھی تھا، میں نے گیت گایا اور میرا سارا دکھ ہوا ہو گیا"۔ شاعری محض ایک مشغلہ ہی نہیں، سامانِ تسکین بھی ہے۔ یہ فن کار کے بنیادی معارضہ یا ستم ظریفانہ تقدیر کی مثال ہے کہ جو چیزیں اس کے لئے سامانِ مصیبت ہوتی ہیں وہی اس کی رنگیں بیانی کا باعث بھی ہوتی ہیں۔ وہ دوسروں کے لئے دکھ برداشت کرتا ہے، ان کے لئے صلیب اٹھاتا ہے، ان کے لئے کڑھتا اور رنج اٹھاتا ہے۔ اس کے لئے دکھ ذریعہ نجات ہے۔ زندگی اس کو غموں کی بھٹی میں جلا جلا کر کندن بنا دیتی ہے۔ اس کے لئے درد ہی دوا ہے۔ عزیزوں کا دکھ، ان کا درد، ان کے حادثے یعنی زندگی کے تمام ایسے المیے اس کی روحانی جلا اور رفرفِ سخنی کا باعث ہوتے ہیں۔ غالب کو اس کا ذاتی تجربہ تھا، اس لئے اس نے کہا تھا کہ ع "خزانِ عزیزاں بہارِ من است" اسی بنا پر براؤننگ (BROWNING) نے آرٹ کو ذریعۂ نجات قرار دیا ہے۔ ایلیٹ (ELIOT) نے اس کو جامع صورت عطا کرتے ہوئے کہا ہے کہ شاعری جذبات سے دامن چھڑانے کا نام ہے۔ فرید بھی ذاتی تجربہ سے اسی نتیجہ پر پہنچا۔ شاعری اس کے لئے تسکینِ روحانی کا باعث ہوئی۔ ادب و فن کا یہی شفا بخش اثر ہے۔ جس نے ہمارے جواں سال

نقاد محمد حسن عسکری کو "شاعری یا علاج الغربا" کی عجیب مماثلت کا احساس دلایا۔

ان تمام امور کے باوجود ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ یہ منظوم افسانہ شاعری ہے۔ عام طور پر اس پہلو کو ضمنی سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ شاعر کا حقیقی کمال یہی ہے کہ اس نے اپنے مشاہدات کو کامیابی کے ساتھ جلوہ گر کیا۔ یہ اس کے فن کا ایک لازمی جزو ہے، جسے کچھ کم اہمیت حاصل نہیں۔ فن کے اعتبار سے مشاہدات کا کامیاب اظہار ہی تو سب سے اہم ہے اور کلام کا شعری کیف قارئین کے لئے ایک مستقل حظ، دلچسپی اور جاذبیت کا سامان۔ آخر ہم اس آلہ کار کی بنیادی اہمیت کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں، جو مشاہدہ کو قوت سے فعل اور خلوت سے جلوت میں لانے کا باعث ہوتا ہے، عام طور پر اس پہلو کو "فن برائے فن" کے تحت لا کر ٹھکرا دیا جاتا ہے، حالانکہ شاعری کی تعمیر کا بنیادی پتھر یہی ہے۔ فن برائے فن کے معنی "فن برائے تعیش نہیں" بلکہ فن بھی ایک قدر ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے، جو تمام مقاصد کیلئے ضروری ہے۔ یہ صرف زندگی ہی کا خادم نہیں بلکہ ہر چیز کا خادم ہے؛ خواہ وہ فسق و فجور ہو یا روحانیت و معرفت۔ آلہ کار کسی خاص چیز سے مخصوص نہیں ہوتا بلکہ تمام مقاصد کے لئے وقف ہوتا ہے، خواہ وہ تخریبی ہوں یا تعمیری، اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ، فاسقانہ ہوں یا عارفانہ۔ اور پھر "فن برائے حیات" کے معنی فن برائے نظریہ حیات نہیں۔ حیات ایک بڑی وسیع چیز ہے اور اس میں کھیل کود، تفریح، عیش و نشاط، ہنسی، ہوا و ہوس سبھی شامل ہیں اور

فن ان سب کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ جیسے پانی کہ تمام عناصر کے ساتھ خود بخود گھل مل جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنے اخلاقی تصورات یا مصلحتوں کے تحت اسے مضر خیال کریں۔ یہ بھی ایک اضافی بات ہے، کیونکہ خیر کو شر اور شر کو خیر میں بدلتے دیر نہیں لگتی۔ آخر کون کہہ سکتا ہے کہ کونسی چیز کس وقت مضر ثابت ہوگی اور کس وقت مفید۔ فن کی کامیابی تو تمام تر اس امر پر موقوف ہے کہ نفسِ مضمون کس خوش اسلوبی سے ادا ہوا۔ اس پر نہیں کہ وہ مضمون فی نفسہٖ اچھا ہے یا برا، محمود ہے یا مذموم۔ شاعری کو بجائے خود بھی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اس سے شاعر کا ذوق، اس کا سلیقہ، اسکے قوائے فکر آشکار ہوتے ہیں۔ یہ تمام مستقل اقدار ہیں، جو معنوی اقدار سے بالکل الگ ہیں اور ان کا مطالعہ بھی لازماً جداگانہ ہونا چاہیئے۔

فرید کے منظوم افسانے میں شاعری کی بعض بہت دلچسپ اور دلکش مثالیں دستیاب ہوتی ہیں۔ مثلاً ؎

حیات معمور ہے فغاں سے، نہیں مفر مرگِ ناگہاں سے
دو لحظہ مستانہ رقصِ خوشتر، سکونِ بے کیفِ جاوداں سے
حدیثِ اَرِنی و لَن ترانی، تحیّر انگیز ہے کہانی
کہ نغمہ پیما ہوئی جو بلبل، تو گل نے بھی بات کی زباں سے!
اتر سکے گا نہ عکس ہرگز، بتوں کا آئینۂ سخن میں
شبیہ لیکے نظر نہ آئی، کبھی عبارت کے پیرہن میں
مقابلہ یار کے دہن کا، میں روز کرتا کلی کلی سے
دمِ سحر جا کے توڑ لاتا، تمام غنچوں کو گلستاں سے

شگاف پڑتے تھے آسماں میں جو نالے کرتا تھا میں دمادم
زمیں کو رنگِ حنا ملا تھا، مگر میری چشمِ خونچکاں سے

ان دونوں اشعار میں تخیل کی سادگی و پرکاری نے کیا سماں پیدا کیا ہے۔ اس طرح یہ اشعار بھی تخیل کی رنگ آمیزی سے کیسی باغ و بہار کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

وہ سحر احساں کبھی نہ اترا، چلا جو اہلِ وفا کے دل پر
ہوا ہے کیا بند کوئی غنچہ، فسونِ بادِ صبا سے کھل کر؟
فلک پر اک چاند کا تھا ٹکڑا، مگر تھا پوشیدہ اس کا مکھڑا
جھلک دکھاتا تھا گاہے گاہے، نکل کے وہ ابر کی ردا سے

شاعری دورِ نبوت سے ہے لاکھوں فرسخ
فرش پر شمع رہے، عرشِ بریں پر اختر

ہے جستجوئے آبِ زندگی کی، تو پہلے عصفور پر نظر کر
وہ کس مشقت سے لحظہ لحظہ، تلاش کرتی ہے دانہ دانہ!

جو تنگ و شوخ و سبک جنوں ہے، تو عشق حیران و سرنگوں ہے
بلا کشی میں ہے عشق برتر، جنونِ بے درد و فتنہ زا سے

گزار وقت اپنا گلستاں میں کہ ہے دلستاں وہ عاشقی کا
جو ذوق لے رنگ و بو کا گل سے، تو سوزِ دل مرغِ صبح خواں سے

اس نظم کا شعری حاصل ذیل کے تین پارے ہیں، جو فکر و بیان میں ایک عالمِ خاص رکھتے ہیں۔

جمال اک مشتری جبیں کا، جو میں نے دیکھا تو دل میں جانا
کہ میری تقدیر کا ستارہ، زمیں پہ اترا ہے آسماں سے
نقاب اٹھائے وہ حسن والا، تو گھپ اندھیرے میں ہو اجالا
نہ چھپ سکے دیدۂ عدو سے، جو شب کو نکلے مرے مکاں سے
وہ ابھرا جوبن! وہ ڈھلی چتون! وہ صبحِ روشن کی مثل گردن
جبیں پہ زلفوں میں ایسی ان بن، نہ جو بیاں ہو کبھی زباں سے
وہ چشمِ آہو! ہلالِ ابرو! پری کا چہرہ! بلا کا گیسو!
نظر میں وہ ساحری کا جادو! کہ مانگ اماں حافظِ زماں سے!
وہ اس کی آواز بانسری سی! عجب سریلی! عجب رسیلی!
جو لب کشا ہو تو کوئی سمجھے، رواں ہے باگیسری دہاں سے!

بنائے ہیں کس نے کوہ و دریا؟ بچھائے ہیں کس نے دشت و صحرا!
یہ کس کا اجبار ہے کہ بادل، زمیں پہ روتا ہے آسماں سے؟
فلک پہ گرمِ سفر ہیں تارے، یہ کیسے تقدیر کے ہیں مارے!
مجال کیا ہے کہ دو قدم بھی، ہوں پیش و پس اپنے کارواں سے
عجیب غنچے میں ہے تبسم! عجیب بلبل میں ہے ترنم!
عجیب دریا میں ہے تلاطم! ہوا ہے پیدا یہ سب کہاں سے؟
سیاہ رو، ناسپاس انساں! جہاں میں آیا نزار و عریاں
اسے دیا کس نے علم و عرفاں؟ وہ ناز کرتا ہے کس زباں سے؟

نہ یہ بھی ابلیس نے بتایا، وہ گرچہ ادراک بن کے آیا
کہ فکر آتی ہے کس جہاں سے نکلتی ہے کس طرح وہاں سے؟
حیات کیا ہے؟ ممات کیا ہے؟ حقیقتِ معجزات کیا ہے؟
مری سمجھ کی بساط کیا ہے، کہ ان کو سمجھوں ہیں غیب داں سے؟

گرمِ فریاد ہے اگر زاہد
کیوں ہو خاموش رندِ عشرت کوش؟
بتقاضائے مصلحت انساں
اپنا دل تھام کر رہے خاموش
خامشی بر محلِ نطق و بیاں
نہیں ہرگز دلیلِ عقل و ہوش
شیرِ خونخوار ہی سہی واعظ!
رندِ میخوار بھی نہیں خرگوش!

کردے سرسبز باغہائے عنب
اور مئے ناب قسمتِ مے نوش!
چمنِ دہر میں پھلیں پھولیں
بادہ کش، بادہ ریز، بادہ فروش!
ذوقِ عشرت اگر ہو پیشا پیش
عیش و مستی عقب میں دوش بدوش
سطحِ گیتی ہو بزم گاہِ طرب
اہلِ گیتی ہوں وقفِ نائے و نوش!
بزمِ رقص و سرود میں ساقی
جامِ صہبا بکف، سبو بر دوش!
خُم پہ خُم پی رہے ہوں اہلِ زمیں!
آسماں رس ہو شورِ نوشا نوش!

پہلے پارے میں "کہ میری تقدیر کا ستارہ زمین پہ اترا ہے آسماں سے" کس قدر دلاویز تصور ہے، بالخصوص جبکہ اس کا تعلق اک "مشتری جبیں" کے جمال سے ہے۔ اس کے بعد گھپ اندھیرے میں اُجالا، ابھرا جوبن، اُدھلی چتون، صبحِ روشن کی مثل گردن، جبیں پہ زلفوں میں ایسی ان بن "کس قدر ستھرے، کنوارے کنوارے، نفیس،

سجل اور دل نشیں الفاظ ہیں! پھولوں کے پھول اور سیپیوں کی سیپیاں، خصوصاً زلفوں کی ان بن" ان کی الجھی سلجھی ادا، انوپ بھاؤ اور ڈھلکتی چھب کی انمول سہانی تصویر ہے۔ سجع کے طنطنہ آفرین بول مصرعے کے بیان اور رسیلے چٹکیلے ترنم پر ایسے ہیں جیسے سونے پر سہاگہ۔ اگلے مصرعے میں تین چھوڑ چار سجع ہیں جو ترنم کو اور بھی چار چاند لگا دیتے ہیں۔ آخری شعر میں سرگم کا سریلا پن اور رسیلا پن واقعی ٹیپ سروں تک پہنچ گیا ہے اور اس کی تان واقعی باگیسری جیسے لشیلے اور اُتم راگ ہی پر ٹوٹ سکتی تھی۔ چوتھے اقتباس میں۔

ذوقِ عشرت اگر ہو پیشا پیش
عیش و مستی عقب میں دوش بدوش

ایک عجیب متناسب تصویر ہے اور متحرک بھی

بہت کم شاعر ہیں جن کے کلام میں فرید کا ذوق، انکا تبحرِ علمی اور سب سے بڑھ کر مدنیت جھلکتی ہو۔ مدنیت سے میری مراد شاعر کی ثقافتی تہہ داری ہے۔ فرید اپنی مدنیت کو کلام میں سمونے میں کامیاب رہا ہے، جس کی شہادت ان پاروں میں مہیا ہوتی ہے
جمالِ شاہد کے استعارے، تو سیکھ سعدی کی بوستاں سے

خطیبِ خود کام کی خطابت، تباحِ تازی ہے فی الحقیقت
جو مضطرب ہو کہ لطف اٹھائے شکار کے مغزِ استخواں سے

رگڑ تھی ابروں کی برق بن کر، جبل پہ ٹوٹی تھی آسماں سے

غرض یہ شیطاں کا سفسطہ تھا، مگر میں سمجھا کہ فلسفہ تھا
ہوا میں بے باک اور نکلا، تلاشِ محبوب ہیں مکاں سے

جو لب کشا ہو تو کوئی سمجھے، رواں ہے باگیسری دہاں سے

نقاب[1] اُٹھائے وہ حسن والا، تو گھپ اندھیرے میں ہو اُجالا

جمالِ انساں بقولِ جوزی[2]، علامتِ حمق و سفلگی ہے

ثبات[3] دل، نشۂ توکّل کہ دل اسی سے ہے مست و بے غم

وہ پدمنی ہو کہ چترنی ہو، وہ سنکھنی ہو کہ ہستنی ہو!

دل کو امیدوں سے بھر، یوں موت سے پہلے نہ مر! (حدیث)

نشاط کیا سوزِ عشق میں ہے یہ کوئی ستیوں سے مل کے پوچھے!

متنبیؔ ہو کہ ہو مانیؔ ارژنگِ قدیم

---

[1] یہ خیال متنبیؔ کے اس شعر سے ماخوذ ہے ؎
اَمِنَ ازْدِیَارَکِ فِی الدُّجَی الرُّقَبَاءُ
إِذْ حَیْثُ أَنْتِ مِنَ الظَّلَامِ ضِیَاءُ

[2] دیکھیے جوزی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف = اَلْحَمْقٰی وَالْمُغَفَّلِیْن۔ (فرید)

[3] وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ۔ سورۃ الطّلاق - آیت ۳۔

اُوڈِ روم، وہ گردونِ ادب کا اختر!

ابو ہریرہ نے ورد سیکھا، بہ صد خوشی دشمنِ خدا سے! (حدیث)

کرتی رہتی ہے صبا اٹھکھیلیاں وقتِ سحر
اس کی موجوں میں ہے یارب! تیری حکمت جلوہ گر!
آتش و چقماق و آہن سے جو اڑتے ہیں شرر
ان کی تصویریں بھی ہیں، محفوظ لوحِ پاک پر!
ہر حبابِ بحر جو اٹھتا ہے، تیرے حکم سے
اور فنا ہوتا ہے موجوں میں تو تجھ سے پوچھ کر!
آہ! اس قطرے کی ہر کروٹ پہ ہے تیری نظر
جو ہزاروں مرحلے طے کر کے بنتا ہے گہُر!

جو یار اُسے بزم سے اُٹھا دے، تو ہے یہی اس کا محتنا نہ

ہے بارِ اثبات مدعی پر، نتیجہ کیا محض ادّعا سے؟

ٹوٹتی ہے دمِ اسقاط ہی بیکس کی کمر

صید افگن ہے نہنگ، اشک سے چشم اس کی ہے تر!

"عرضِ حال" کے آخر میں شاعر نے بیان کیا ہے کہ اسے عشقِ مجازی سے دشمنی ہے اور یہ نظم اس کے خلاف پرچار ہے یعنی یہ کہ ،

"سکھی اگر میں جانتی ، پریت کیئے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹتی ، پریت کرے نا کوئے"

مگر اس میں عشقِ مجازی کا کیا دوش ہے ؟ یہ تو انسان کی روحانی جلا اور انسانی فطرت کی بلندی کا باعث ہے ۔ صرف جذبہ کی صداقت شرط ہے ۔ جس قسم کا عشق پرچار کی زد میں آتا ہے ، اس کی وضع اور ہے ۔ اور شاعر نے نظم کے آخر میں اس کی بڑے پرلطف طریقہ سے وضاحت کردی ہے ۔ میرا مطلب اس بڑے دلچسپ ڈرامائی انجام سے ہے جس میں ظرافت کی چٹکیاں عجیب لطف دیتی ہیں ۔ محبوبۂ طناز اور واعظ کی "جنگِ فتنہ زا" واقعہ کے طور پر بڑی مزے دار اور چٹپٹی ہے ۔

"ہوا زمانہ ملی نہ پائی ، ہے مفت میں ہم سے آشنائی !
کہاں ہے وعظوں کی دکھائی ، کہ جس کا وعدہ تھا ابتدا سے ؟
کما کے لائیں نہ عشق والے ، تو کھائیں کیا خاک حسن والے !
کہ زندہ انسان ہے غذا سے ، نہیں وہ جیتا فقط ہوا سے
نہ کوئی گھر در ، نہ زر نہ زیور ، نہ گرم روٹی ، نہ نرم بستر
ملا یہ انعام اس حسیں کو ، جو عشق کرتا رہا گدا سے
ہمیشہ قلاش اگر ہو عالم ، تو کیا رہے عقل اس کی سالم !
عمامہ نانِ جویں یہ بیچے ، جو تنگ ہو بھوک کی جفا سے
غرض حقیقت سے پردہ اٹھنے کا یہ منظر بہت کرارا ہے

اور تلقین کے ساتھ کافی حظ بھی بہم پہنچاتا ہے ۔

افسانہ اپنے ساتھ نقاد کو بھی لے بہا ہے ، لیکن ہم فرید کے ساتھ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ع

شاعری فکر و نظر اور بیاں کا منتر
اور یہ منتر اس کی شاعری کا منتر بھی ہے ۔

رفیق خاور

کراچی ۔ ۷ فروری ۱۹۵۶ء

گزارش

آج سے تقریباً پچیس سال قبل ، میں نے یہ افسانہ جس حال میں لکھا، اس کا ذکر میں "عرضِ حال" میں کر چکا ہوں۔ اس کی اشاعت میں تاخیر کے کئی اسباب تھے۔

میری رفیقۂ حیات کی وفات کے بعد افسانہ لکھتے لکھتے جب میرا اضطراب دور ہوا اور افسانہ تکمیل کو پہنچا، تو دینِ اسلام کی خدمت کی خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی۔ چنانچہ میں نے پریرز آف محمدؐ (PRAYERS OF MUHAMMAD) کی تالیف کا کام شروع کر دیا، جس سے مجھے کافی سکون حاصل ہوا۔ الحمدللہ کہ یہ کتاب آج دنیا کے اکثر ممالک میں پڑھی جاتی ہے۔

چونکہ شہرت کی خواہش میرے دل میں مطلق نہ تھی۔ اس لئے افسانہ کی اشاعت خود بخود التوا میں پڑتی گئی۔ جس شخص کے لئے زندگی بے لطف ہو۔ اسے شہرت کی کیا پروا۔ اگر یہ خواہش ہوتی تو باوجود میری عدالتی مصروفیات کے، یہ آج سے کئی سال قبل چھپ کر قارئین کی خدمت میں پہنچ چکا ہوتا۔ یا میں کم از کم مشاعروں میں ضرور شرکت کرتا۔ لیکن افسوس ہے کہ تمام عمر میں کبھی میں کسی مشاعرہ میں شرکت نہ کر سکا۔ یہ عزلت گزینی کوئی تعریف و توصیف کی بات نہیں

بلکہ خستہ دلی کی علامت ہے۔ شہرت کی خواہش ایک فطری تقاضہ ہے جو بجز مردہ دل افراد کے ہر کس و ناکس میں کم و بیش موجود ہوتا ہے۔ نام و نمود کی تمنا ایک زبردست محرک قوت ہے۔ جو انسان کو بڑے، مشکل، اور مفید کام کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ تاریخ نے جن عظیم الشان انسانی کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے اکثر کارناموں کی محرک یہی نام و نمود کی تمنا تھی۔

خطبۂ شیطانی ایک مدت تک یونہی طاقِ نسیاں میں پڑا رہا۔ کبھی کبھار خیال ہوتا تھا کہ اسے شائع کر دینا چاہیئے۔ ایک مرتبہ ایک مقدمے کے سلسلے میں مجھے لاہور جانا پڑا۔ خیال ہوا کہ افسانہ ساتھ لیتا چلوں، اور کسی اچھے نقاد سے مشورہ کروں کہ آیا یہ اشاعت کے قابل ہے بھی۔ مولانا ظفر علی خاں اس زمانے میں بقیدِ حیات تھے۔ موصوف نے افسانہ کے چند حصے دیکھے، میری بے حد حوصلہ افزائی کی اور فرمایا کہ "آپ اسے جلد طبع کرا کے میرے پاس بھیجئے، میں اس کا قارئین سے تعارف کراؤں گا۔ تعارف میں یہ ضرور تاکید کروں گا کہ ہر طالب علم اس افسانہ کا آخری باب حفظ کر لے، کیونکہ وہ اسلام کی اخلاقی تعلیم کا نچوڑ ہے۔" افسوس کہ یہ افسانہ مرحوم کے حینِ حیات میں نہ طبع ہو سکا۔

پاکستان بننے کے بعد، میں نے اس کے چند سو نسخے چھاپے اور دوستوں میں تقسیم کر دیئے۔ چونکہ مالی منفعت کا خیال نہ تھا اس لئے میں نے اسے کسی کتب فروش کی دکان پر نہ رکھا۔ اس کے

نسخے میں نے پاکستان اور بھارت کے مشہور ناقدین کی خدمت میں بھیجے اور
ان سے درخواست کی کہ وہ تبصرہ کی شکل میں، اس پر اپنی رائے ظاہر کریں۔

پاکستان اور بھارت کے مشہور اہلِ قلم کی جانب سے متعدد تبصرے
میرے پاس پہنچے۔ ان کے علاوہ اور کئی شہروں سے مجھے خطوط موصول
ہوئے جن میں شکایت تھی کہ یہ کتاب کہیں بازار میں نہیں ملتی۔ لیکن یہ
تبصرے بھی کئی سال یونہی پڑے رہے۔ اب وکالت کے پیشے سے کنارہ کش
ہو چکا ہوں۔ خطبۂ شیطانی طبع کرا کے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اگر کسی تصنیف کے ساتھ بہت سے تبصرے جو اس کی تعریف و توصیف
میں ہوں، ملحق کئے جائیں تو وہ اس تصنیف کی وقعت بڑھانے کے بجائے
گھٹا دیتے ہیں۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر، مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کا "تعارف"
اور جناب رفیق خاور صاحب کا تبصرہ افسانے کے ساتھ جوڑ دینے پر اکتفا
کرتا ہوں۔ سالک مرحوم نے تعارف ۱۹۵۴ء میں لکھا جب کہ وہ کراچی
میں مقیم تھے اور ان کا تعلق ریڈیو پاکستان کراچی سے تھا۔ خاور صاحب
(امروزہ ڈپٹی ڈائرکٹر ڈیپارٹمنٹ آف پبلیکیشنز، حکومتِ پاکستان) نے
تبصرہ ۱۹۵۶ء میں لکھا جب وہ "ماہِ نو" کراچی کے مدیر تھے۔

عبدالمجید سالک کو (خدا انھیں غریقِ رحمت کرے!) اردو ادب کی دنیا میں
جو مقام حاصل ہے اس سے کون واقف نہیں۔ جب تک اردو ادب زندہ ہے
مرحوم کی یاد بھی زندہ رہے گی۔ چونکہ شاعری ایک فن ہے اس لئے سالک مرحوم اور رفیق خاور
صاحب نے اپنی تحریروں میں "ادب" اور "فن" کی بحث چھیڑی ہے۔ قارئین
"ادب" اور "فن" کے موضوع پر ان دو نامور ناقدوں کے افکار کا بڑی دلچسپی سے
مطالعہ کریں گے۔ اس باب میں ان کی بحث اردو ادب میں یادگار رہے گی۔

خاور صاحب ایک اچھّے اور سچّے تبصرہ نگار ہیں۔ ایک اچھّا اور سچّا
تبصرہ نگار محض ستائش گر نہیں ہوتا۔ وہ جہاں کسی تصنیف کی خوبیاں بیان
کرتا ہے، وہاں اس کی خامیوں پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ خاور صاحب
"تبصرہ" میں اسی اصول کے پابند رہے ہیں۔ آپ نے افسانہ کی
خامیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اور ہلکے قلم سے مجھ پر بھی چوٹیں کی ہیں،
جو ان کی صداقت اور حق گوئی کی مظہر ہیں۔

مجھے شعر گوئی کا کوئی ایسا بے چین کر دینے والا شوق نہیں جو
عموماً شعراء میں ہوتا ہے۔ میری شاعری تمام تر ایک قسم کی اجباری
شاعری رہی ہے۔ "خطبۂ شیطانی" میں نے انہماک پیدا کرنے کی غرض
سے لکھا۔ "تلقینِ رحمانی" کے حصّہ دوم میں جو نظمیں ہیں وہ سالک مرحوم
کی ترغیب سے لکھی گئی تھیں۔ مرحوم میری طبیعت کی افتاد سے
خوب واقف تھے۔ وہ وقتاً فوقتاً مجھے تاکید بلکہ تنبیہہ فرمایا
کرتے تھے کہ میں مشقِ سخن جاری رکھوں۔ "تعارف" میں بھی انھوں نے
یہی تاکید فرمائی ہے۔ یہ نظمیں ان کی ناراضگی کے خوف سے لکھی
گئی تھیں۔ اعمال کے ثواب کا دار و مدار نیات پر ہوتا ہے،
پس ان نظموں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق جو
اصلاحی اشارات ہیں، ان کے ثواب کا مستحق میں نہیں، بلکہ سالک
مرحوم ہیں۔

وَآخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

عبدالحمید فرید
کراچی، ۱۰ ستمبر ۱۹۷۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

عرضِ حال

یہ افسانہ میں نے بے انتہا غم و اندوہ کے عالم میں لکھا ہے۔
چند سال قبل میری رفیقۂ حیات (مسعودہ خاتون) جو ایک نہایت
نیک طینت اور پاک فطرت خاتون تھیں، تقریباً سولہ سال کی رفاقت
کے بعد ایک ہفتہ کی علالت میں، اچانک دُنیا سے رحلت کر گئیں۔
انہیں کے زہد و تقویٰ اور دُعاؤں کے اثر سے میرا ایمان راسخ ہوا۔
مرحومہ نے اپنی زندگی کے تیس سال پورے کئے تھے۔ میں نادانوں
کی طرح، بے فکری میں زندگی بسر کر رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ
جب تک میری زندگی ہے، مرحومہ جنگ حیات میں میرے ساتھ
ساتھ رہیں گی۔ ان کی قبل از وقت اور ناگہاں جدائی سے مجھے
جو صدمہ ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ مجھے مرحومہ سے بے حد
محبّت تھی، اور وفات سے قبل وہ بالکل تندرست تھیں، اس
صدمے کو میں نہ برداشت کر سکا، آرام و آسائش کی زندگی غم و اندوہ
میں مبدّل ہو گئی۔ میں کئی روز خواب و خوراک سے محروم رہا۔ جنون کی
علامتیں پیدا ہونے لگیں۔ اسی دوران میں، ایک رات دو بجے،

از خود رفتگی کے عالم میں، اپنی لائبریری میں کسی ایسی کتاب کی جستجو
میں تھا۔ جس سے دل بہلے، اچانک دیوانِ حافظ پر نظر پڑی،
دیوان اُٹھا کر، ایک شعر پڑھا تھا۔ دفعتہً دل میں خیال گزرا کہ کیوں
نہ میں خود ہی شعر کہہ کے دل بہلاؤں! بس یہی اس افسانے کی ابتدا
ہے۔ اس افسانے کا بڑا حصہ میں نے بے خودی کے عالم میں مرحومہ
کے مزار کے پاس بیٹھ کر لکھا، اس لئے کہ اُن کو افسانے سُننے کا بڑا
شوق تھا، اور لطیفے سن کر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جایا کرتی
تھیں، پہلا شعر جو میرے غمزدہ دل نے بنایا یہ تھا: ؎

رقم کریں کیا فسانہ اپنا، کہ ہوش گم ہیں ترے ستم سے!
ہماری بربادیوں کو نسبت، نہیں ہے کچھ کاغذ و قلم سے!

خوانندگانِ عزیز، اس قصہ کے مزاحیہ اشعار پڑھ کر شاید اس
نتیجہ پہ پہنچیں کہ یہ کسی بے فکر و خوش دل انسان کا لکھا ہوا افسانہ ہے
لیکن حقیقت برعکس ہے۔ جب کبھی اس نوع کے اشعار نکلتے تھے۔
تب کبھی میری آنکھیں مرحومہ کی جدائی سے اشک بار رہتی تھیں، انسان
کے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہے۔ ایک رواں شناس ہی خوب
سمجھ سکتا ہے، کہ بعض موقعوں پر، انسان ایک ہی وقت میں کس طرح
ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے۔

میں نے طالبعلمی کے زمانے میں کل تین چار ہفتے مشق سخن کی
تھی، اس زمانے میں جو اشعار بنتے تھے، وہ خاطر پذیر نہ تھے لہٰذا
میں شعر گوئی سے کنارہ کش ہو گیا۔ البتہ اس زمانے میں شعراء کا کلام
پڑھ کر وجد میں آنا یہی تحصیل علم اور کھیل کود کے علاوہ میرا تنہا مشغلہ

تھا۔ طالبعلمی کا دور ختم ہوا، تو میرا رشتہ اُردو ادب سے منقطع ہوگیا
سالہا سال تک نہ میں نے کبھی کوئی اُردو کتاب پڑھی نہ کوئی اُردو
اخبار یا رسالہ، مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اُردو ادب کی دنیا میں کیا
ہو رہا ہے، اور کن اشخاص نے نظم یا نثر میں اچھی کتابیں لکھی ہیں
ایسی حالت میں یہ خواہش میرے دل میں کس طرح پیدا ہوسکتی تھی کہ میں
اُردو شعر و سخن کی دنیا میں کوئی کام کروں۔ تحصیلِ علم کا دور ختم ہوا، تو
میرے مطالعہ کا تعلق صرف عربی، فارسی اور انگریزی کتابوں سے رہا۔
یہی ارمان تھا کہ چند سال بعد وکالت کے شغل سے کنارہ کش ہوکر انگریزی
میں مفید کتابیں لکھوں۔ میں نے کبھی خواب میں بھی یہ نہ سوچا تھا کہ اُردو
میں کوئی منظوم افسانہ لکھوں گا۔ لیکن سارے کام خدا کے ارادے
سے ہوتے ہیں، اور انسان ایک حد تک بے بس ہے۔

اس افسانے کا پلاٹ میں نے اسی رات سوچا جب شعر کہنے کا
ارادہ میرے دل میں مستحکم ہوگیا۔ مثنوی کی سات معروف بحروں کو
آزمایا، لیکن وہ میرے طرزِ بیان کے لئے مناسب نہ معلوم ہوئیں۔
میری رائے میں بحر متقارب مقبوض اثلم جس میں یہ افسانہ لکھا گیا ہے،
مثنوی کے لئے مناسب بحر ہے۔ ایک شعر کے چار ٹکڑے ہوتے
ہیں، ایک ہی شعر میں چار مختلف باتیں بتائی جاسکتی ہیں۔ خیال
کیسا ہی نازک یا پیچیدہ ہو، ایک ہی شعر میں بڑی آسانی سے
بیان کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اکثر اوقات شکستِ ناروا کی مشکل درپیش
ہوتی ہے، میرا خیال ہے شاعر اس کی بھی پروا نہ کرے، عربی نظموں
میں تو ایک مصرعے کے آخری لفظ کو توڑ کر دوسرے مصرعے سے جوڑا

جاتا ہے، دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں ؎

وَحقُوقُ تُرَقِّقُ الْقَلْبُ لِلْقَلْـ ...... ـبِ وَلَوْ ضُمِّنَتْ قُلُوْبُ الجمادِ

کَسَفَتْ سَاعَةً کَمَا تَکْسِفُ الشَّمـ ...... ـسُ وَعَادَتْ وَنُوْرُهَا فِی ازْدِیادِ

ملاحظہ ہو، کہ "قلب" اور "شمس" دونوں الفاظ کس بیدردی سے توڑ کر
دوسرے مصرعے میں جوڑے گئے ہیں۔ اس ظلم کو اردو کا مذاق قبول
نہ کرے، لیکن شکستِ ناروا کو شکستِ مباح سمجھا جائے، اور بحرِ
متقارب مقبوض اثلم، یا اسی قسم کی چار ٹکڑوں والی بحر مثنوی یا داستان
گوئی کے لئے چُن لی جائے تو اُردو میں بلینک ورس کی ضرورت محسوس
نہ ہوگی۔ البتہ ہر مضمون کے لئے یہ بحریں موزوں نہیں۔ جذبات اور
فلسفیانہ تخیّل کے لئے وہی بحریں مناسب ہیں جن میں اچھی غزلیں لکھی
گئی ہیں۔ اس لئے موضوع کے لحاظ سے بعض موقعوں پر بحر بدل دینے
میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یورپ کے متعدد شعراء نے ایسا کیا ہے۔ اس
قصہ میں بعض موقعوں پر میں نے بھی بحر بدل دی ہے تاکہ اس کی
یک نواختی سے پڑھنے والا تنگ نہ آئے اور مضمون بھی اشعار میں
ٹھیک بیٹھے، میں نے اپنے کلام میں، تعقیدِ لفظی، تکرارِ الفاظ، ایطاء
اور عیبِ تنافر سے حتی المقدور بچنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اچھی
عبارت اور الفاظ کی موسیقیت کے مقابلے میں ان عیبوں کی میں نے
مطلق پروا نہ کی، جدید فارسی کے متعدد الفاظ جو عموماً اُردو میں نہیں
بولے جاتے، میں نے اپنے کلام میں بلا تکلّف استعمال کئے ہیں تاکہ
اردو کے ذخیرہ میں اضافہ ہو۔ اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ یہ الفاظ اُردو میں
مستعمل نہیں ہیں، اس لئے انہیں غیر شاعرانہ سمجھنا چاہئے، تو میں

عرض کروں گا کہ اس اصول پر عمل کرنے سے اردو ادب کی ترقی غیر ممکن ہے۔ میں نے یہ باتیں دیباچہ میں اسلئے لکھی ہیں کہ خوانندگانِ عزیز پر واضح ہو کہ یہ افسانہ کن اصول کے ماتحت لکھا گیا ہے۔

افسانے کے پلاٹ میں ایک واعظ بھی شریک ہیں، کوئی شخص اپنے دل میں یہ گمان ہرگز نہ پیدا ہونے دے کہ میں کسی شخصیت کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ میں عالموں اور واعظوں کا نہ صرف احترام کرتا ہوں بلکہ دلدادہ بھی ہوں۔ انہیں کی جد وجہد سے آج بھی اسلام کا باغ سرسبز و شاداب ہے، اور انشاء اللہ تا قیامت رہے گا۔ اس افسانے میں جس فرضی واعظ کو شریک کیا گیا ہے، وہ بھی باوجود اپنی گمراہی کے، اپنے دوستوں کے حق میں باعث سعادت ہے، اور بہت سی ایسی باتیں بتاتا ہے جن سے انسان کے دل و دماغ کی اصلاح ہوتی ہے۔ واعظ ہی کی نصیحت آمیز باتیں اور دعائیں سن کر اس افسانے کے ہیرو کا ایمان مستحکم ہوتا ہے۔ واعظ کا مکتوب منظوم میرے نام ایک فرضی خط ہے۔ الحمد للہ نہ میں ریا کار ہوں، نہ مے خوار۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر میں نے کسی فرضی واعظ کو بدنام کیا ہے، تو اس فرضی واعظ کو بھی حق حاصل ہے کہ مجھ سے انتقام لے۔

شیطان کی تقریروں میں تضاد ہے۔ یہ اس کا کمال ہے کہ وہ موقع اور محل کی مناسبت سے دلیلیں پیش کرتا ہے۔ ان دلائل میں نہ صحت ہوتی ہے، نہ مطابقت۔ اکثر دلیلیں ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں۔ اگر اس کے استدلال میں صحت ہو، تو پھر اس کی شیطنت ہی باقی نہیں رہتی۔ اس طرح خطیبِ فاضل کے فکر و عمل

میں بھی اختلاف ہے۔ یہ کیفیت بجز انبیاء اور اولیاء کے بڑے بڑے باکمال انسانوں میں پائی جاتی ہے۔

افسانے میں مثنوی کے اصولوں کی پابندی نہیں کی گئی۔ نہ اسکے ہر شعر کا قافیہ جداگانہ ہے، نہ یہ ایک بحر میں لکھا گیا ہے۔ اس کا اسلوب بیان بھی مثنوی کے طرزِ بیان سے مختلف ہے۔

طالبِ علمی کے زمانہ میں اردو، فارسی، اور عربی شعرا کا کلام پڑھ کر شعر فہمی کی جو استعداد مجھ میں پیدا ہو گئی تھی اس پر، اور اپنے طبعی ذوق پر اعتماد کر کے میں نے یہ افسانہ لکھا ہے، اس افسانے سے قبل نہ میں نے شاعری کی طرف توجہ کی، نہ کبھی کچھ لکھا، اور بجز کتابوں کے نہ مجھے کسی سے شعر و سخن میں استفادہ کا موقع مل سکا، نہ میں کسی مشاعرے میں شریک ہو سکا۔ قطع نظر اس کے کہ میرے کلام میں شاعرانہ محاسن یا معائب ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ افسانہ دلچسپ اور سبق آموز ہے، اور اس میں بتائی ہوئی باتیں ہر ہر پڑھنے والے کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔

مجھے عشقِ مجازی سے دشمنی ہے، اس لئے کہ میں خود اس کا شکار ہو چکا ہوں اور اپنی اہلیہ مرحومہ کی جدائی میں "سوزِ دروں" کا مزا چکھ چکا ہوں، جو شاید مجھے دار المجانین میں پہنچا دیتا۔ اس باب میں جو اشعار میں نے لکھے ہیں، وہ درحقیقت عشقِ مجازی کے خلاف اپنے ہی نفس کو تلقین ہے۔ جسے انگریزی میں سلف سجیشنز (SELF-SUGGESTIONS) کہتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ شعر گوئی نے مجھے جنون کے پنجے سے نجات دی۔

۱ اس کتاب کی اشاعت میں اس وجہ سے تاخیر ہوئی کہ میں اپنی انگریزی تالیف پیریرز آف محمد PRAYERS OF MUHAMMAD کے لکھنے اور مرتب کرنے میں مصروف تھا۔ الحمدللہ کہ اس سے قبل وہ کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔

میری دُعا ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے ہر مسلمان کا ایمان راسخ تر ہو اور غیر مسلم بھی اسلام کی تعلیم سے آشنا ہوں۔

عبدالحمید فرید

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا۔ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۰

خطبۂ شیطانی اور تلقینِ رحمانی

باب (۱)

قہرمانِ افسانہ جس کا نام زید ہے ایک مفکّر جوان ہے۔ شام کے وقت وہ راستے سے گزر رہا ہے۔ دیکھتا ہے کہ ایک جلسہ میں ایک صوفی وعظ فرما رہے ہیں زید جلسے میں شریک ہوتا ہے۔ ذیل کے بند میں وعظ کی کیفیت بیان کرتا ہے۔

سُن اے دلارام یہ فسانہ، کہ شہرِ شملہ[ط] میں ایک صوفی

دمِ غروبِ آب موعظت سے، قلوب لوگوں کے دھو رہا تھا

ط وہ شہر جہاں انصاف نہ ہو، اندھیر ہو، اندھیر نگری۔

"ثوابِ اعمالِ صالحہ" پر، تھا وعظ اس پیرِ پارسا کا

وہ اپنی سِلکِ سخن میں پیہم، دُرِ معارف پرو رہا تھا

فیوض "سوزِ دروں" کے صد ہا سُنا رہا تھا وہ سامعیں کو

اور ان میں "سوزِ بروں" نہ پا کر غضب سے بیتاب ہو رہا تھا

مگر خطابت ہے کارِ مشکل، نہ تھا خطیب اس ہنر میں کامل

ہوئی تھی بےزار اس سے محفل، وقار اپنا وہ کھو رہا تھا

نہ اس میں بُلبُل کا تھا ترنّم، نہ غنچۂ شوخ کا تبسّم

ریاضِ دل میں وہ تخمِ دیں کو غلط طریقے سے بو رہا تھا

نہ بذلہ سنجی بیاں میں اس کے، نہ زورِ حجّت، نہ سوز و رِقّت

اگرچہ وہ اپنے آنسوؤں سے بساطِ محفل بھگو رہا تھا

مجال دورانِ وعظ میں تھا کہ صدرِ محفل سے بھاگ جائے

وہ قیدیٔ بزم سر جھکائے نصیب کو اپنے رو رہا تھا

خطیب نے آہ بھر کے پوچھا، کہ ہائے لوگو، یہ خواب کب تک؟

کہاں سے ملتا جواب اس کو کہ سارا مجمع ہی سو رہا تھا!

ہوئی تھی برخاست اب وہ محفل وہیں سے لیکن کوئی ستمگر

غریب واعظ کے پاک دل میں زباں کا نشتر چبھو رہا تھا

خطیبِ خود خواہ کی خطابت سُلائے محفل کو یا اُٹھائے

دہانِ زخمِ جگر سے آئے، صدا جو لب پر تو خوں رُلائے!

باب (۲)

گھر پہنچتے پر زید واعظ کے نصائح پر غور کرتا ہے۔ ناگہاں ابلیسِ لعین آکر زید کے گوشِ دل سے باتیں کرتا ہے جو ذیل کے بند میں درج ہیں۔

ابلیس کا خطبۂ اوّل

سُنا اُسی شب کو گوشِ دل نے، یہ وعظ ابلیس کی زباں سے
کہ "ذوقِ سوزِ دروں" ہو تجھ کو تو مِل کسی شمع رو جواں سے
حیات معمور ہے فغاں سے، نہیں مفر مرگِ ناگہاں سے
دو لحظہ مستانہ رقص خوشتر، سکونِ بے کیف جاوداں سے!
نہ جان کھو محنت و تعب میں، شریک ہو محفلِ طرب میں
نشاط ہے دخترِ عنب میں، تو مست ہو اُس کے ارمغاں سے!
گزار وقت اپنا گلستاں میں کہ ہے دبستاں وہ عاشقی کا
جو ذوق لے رنگ و بو کا گُل سے، تو سوزِ دل مرغِ صبح خواں سے!

نہ قطع کر رشتۂ تغزّل، اگر ہے ذوقِ سخن بھی تجھ کو
جمالِ شاہد کے استعارے، تو سیکھ سعدی کی بوستاں سے!
جمالِ گُل اور کمالِ بُلبل، ہیں مایۂ شوقِ دیدہ و دل
وہ ذوق ہی کیا جو لطف اندوز ہو نہ قدرت کے ارمغاں سے!
قرار مفقود ہے جہاں میں، بہار ہے آج گُلستاں میں
تو کل تمام اُس کی زیب و زینت، ہٹے گی پامالیٔ خزاں سے!
جہاں کی ہر شے ہے آنی جانی، بشر کی جانِ حزیں ہے فانی
ترا بھی مُشتِ غبار اُٹھے گا کسی دن اس تیرہ خاکداں سے!
تلاشِ آثارِ رفتگاں میں، عبث بھٹکتا ہے کیوں جہاں میں
تو نامرادی کا دَرس سُن لے، چمن میں بُلبل کے آشیاں سے!
عَمَل کی نسبت ہے شورِ واعظ، جہاں کی خدمت کا ہے تقاضا
جہاں نے کیا سُکھ دیا ہے تجھ کو، نہ کچھ سروکار رکھ جہاں سے!
خطیبِ خود کام کی خطابت، نُباحِ تازی ہے فی الحقیقت
جو مضطرب ہو کہ لطف اُٹھائے، شکار کے مغزِ استخواں سے!

عمل سے رہ دور، یارِ غافل! یہی ہے ذوقِ عمل کا حاصل

کہ تیغِ حسرت سے دل ہو گھائل، مفر نہ عامل کو ہو فغاں سے!

تو لے سبق حالِ کوہکن سے جو مٹ گیا کلفت و محن سے

عمل کا اجر اُس نے خوب پایا، ضمیرِ پرویزِ کارداں سے!

وہ کون انسانِ لم یزل تھا، جو گرمِ ہنگامۂ عمل تھا

عمل کے پھل کو کفن میں باندھے، گیا جو ہنستا ہوا جہاں سے؟

خدا ہوا طور پر ہویدا، تو کس طرح خود ہوا وہ پیدا؟

نمودِ بے بود کے وہ شیدا، کلیم سمجھائیں کچھ بیاں سے

وہ جلوۂ نورِ طورِ سینا، ہوئے تھے بیہوش جس سے موسیٰ!

رگڑ تھی ابروں کی، برق بن کر، جبل پہ ٹوٹی تھی آسماں سے

نہ پوچھ زُہّاد کا تخیّل! رہی نہ اب طاقتِ تحمّل!

کہ طوطیِ فکر اُن کا اُڑ کر، ملا ہے عنقائے بے نشاں سے

حدیثِ ارنی و لن ترانی، تحیّر انگیز ہے کہانی

کہ نغمہ پیدا ہوئی جو بلبل، تو گُل نے بھی بات کی زباں سے!

عجم تلک شور ہے عرب سے، ڈراؤ رحمٰن کے غضب سے!

تضاد کتنا ہے اس بیاں میں، ہوا ہے نازل جو آسماں سے

خدا کو پیاری ہے آزمایش؛ شگفت آمیز ہے یہ خواہش!

جو عالمُ الغیب اس کو مانا، تو پائے گا کیا وہ امتحاں سے؟

وہ درسِ فرسودۂ دبستاں، کہ نارِ نمرود تھی گلستاں

خلیل جس میں تھے شاد و خنداں، سنا ہے اطفال کی زباں سے

صلاح کیسی، فلاح کس کی، نہیں اگر نغمہ و گل و مل؟

عبث ہے کیوں شورِ پنجگانہ؟ گداز کیوں دل میں ہے اذاں سے؟

ثوابِ جنّت، عذابِ دوزخ، بنے ہیں واعظ کی داستاں سے

ہزاروں اس رنگ کے فسانے، سنے ہیں بچّوں نے اپنی ماں سے

سنا ہے تو نے اگر یہ خطبہ، تو غور کر کیا ہے میرا رتبہ!

ترا ہی ادراک ہوں میں ہمدم، مجھے نہ ابلیس کہہ زباں سے"

بڑا ہی بدبخت ہے وہ انساں، جو ان دلیلوں کو مان جائے!

کرے نہ تسلیم ان کو مسلم، ہزار بار اُس کی جان جائے!

باب (۳)

زید کا تاسّف کہ جب وہ نادان اور گمراہی کی طرف مائل تھا تو اس کے گمراہ کن ادراک نے یا ابلیس نے اُس سے وہ حقائق چھپائے جو وجود و رحمتِ باری کو ثابت کرتے ہیں۔

یہ مجھ سے ابلیس نے چھپایا، کہ کس نے کون و مکاں بنایا
نظامِ عالم ہے کس کے بل پر، چلے ہیں شمس و قمر کہاں سے
زمیں پہ یہ باغ و راغ لاکھوں، فلک پہ روشن چراغ لاکھوں
یہ فیل و ابل و اُلاغ لاکھوں، بنے ہیں کس دستِ کارداں سے؟
بنائے ہیں کس نے کوہ و دریا؟ بچھائے ہیں کس نے دشت و صحرا؟
یہ کس کا اجبار ہے کہ بادل، زمیں پہ روتا ہے آسماں سے؟
فلک پہ گرمِ سفر ہیں تارے، یہ کیسے تقدیر کے ہیں مارے!
مجال کیا ہے کہ دو قدم بھی، ہوں پیش و پس اپنے کارواں سے
عجیب غنچے میں ہے تبسّم! عجیب بُلبُل میں ہے ترنّم!
عجیب دریا میں ہے تلاطُم! ہوا ہے پیدا یہ سب کہاں سے؟

سیاہ رو، ناسپاس انساں! جہاں میں آیا نزار و عُریاں
اسے دیا کس نے علم و عرفاں؟ وہ ناز کرتا ہے کس زباں سے؟
نہ یہ بھی ابلیس نے بتایا، وہ گرچہ ادراک بن کے آیا
کہ فکر آتی ہے کس جہاں سے، نکلتی ہے کس طرح دہاں سے؟
حیات کیا ہے؟ ممات کیا ہے؟ حقیقتِ معجزات کیا ہے؟
مری سمجھ کی بساط کیا ہے، کہ ان کو سمجھوں میں غیب داں سے!
یہی ہے مقصودِ امتحاں سے، کہ بندہ مانے دل و زباں سے
وہی جزا جس کا مستحق ہوں، مجھے ملی ربِّ دوجہاں سے"
اگر تو چاہے کہ دل ہو روشن، سمجھ میں آئیں خدا کی باتیں
تو دور کر اپنے وَسوسوں کو، گزار سجدوں میں اپنی راتیں

باب (۴)

ابلیس کی ہدایت کے مطابق زید اس تلاش میں نکلتا ہے کہ کسی کو اپنا محبوب بنائے آخرکار ایک صاحبِ جمال کو دیکھ کر فریفتہ ہوتا ہے

ذیل کے بند میں اپنے محبوب کے حُسن کی تعریف کرتا ہے

غرض یہ شیطاں کا سفسطہ[1] تھا، مگر میں سمجھا کہ فلسفہ تھا

ہُوا میں بے باک اور نکلا، تلاشِ محبوب میں مکاں سے

جو عشق آٹھوں پہر رُلائے، جو ہوش و ادراک پر بھی چھائے

وہ عشق ابلیسِ مہرباں نے، دیا مجھے کوچۂ بتاں سے

جمال ایک مشتری جبیں کا، جو میں نے دیکھا تو دل میں جانا

کہ میری تقدیر کا ستارہ، زمیں پہ اُترا ہے آسماں سے

---

[1] لغو اور گمراہ کن استدلال جسے انگریزی میں سوفسٹری (SOPHISTRY) کہتے ہیں۔

نقاب[1] اُٹھائے وہ حُسن والا، تو گھُپ اندھیرے میں ہو اُجالا

نہ چھُپ سکے دیدۂ عدو سے، جو شب کو نکلے مرے مکاں سے

وہ اُبھرا جوبن! وہ ادھ کھلی چتون! وہ صبحِ روشن کی مثل گردن!

جبیں پہ زلفوں میں ایسی آن بن، نہ جو بیاں ہو کبھی زباں سے!

وہ چشم آہو! ہلالِ ابرو! پری کا چہرہ! بلا کا گیسو!

نظر میں وہ سامری کا جادو! کہ مانگ اماں حافظِ زماں سے!

وہ اُس کی آواز بانسری سی! عجب سریلی! عجب رسیلی!

جو لب کُشا ہو تو کوئی سمجھے، رواں ہے باگیسری دہاں سے!

غضب ہے مستانہ چال اُس کی، نہ دیکھی واللہ مثال اسکی

رہے جوانی بحال اُس کی، خدا بچائے اُسے زیاں سے!

جو رقص کو اُس کے مور دیکھے، تو بن میں غیرت سے مُنہ چھُپائے

اگر سُنے اُس کا نغمہ بلبل، تو جان دے گر کے آشیاں سے

---

[1] یہ خیال متنبی کے اس شعر سے ماخوذ ہے ؎

أَمِنَ ازْدِيَارَكِ فِي الدُّجَى الرُّقَبَاءُ　　إِذْ حَيْثُ أَنْتِ مِنَ الظَّلَامِ ضِيَاءُ

(ترجمہ) اے میرے محبوب! میرے رقیب مطمئن ہیں کہ تو شب کی تاریکی میں مجھ سے نہیں مل سکتا۔ کیونکہ جس تاریکی میں تو ہو گا وہاں روشنی ہو گی۔

نہ پُوچھ تو اُس صنم کا قامت، کہ وہ قیامت کی ہے علامت!

کہیں کمر کا نشاں نہ پایا، کسی نے پُوچھا بھی غیبِ داں سے

اُٹھے وہ دامن اگر جھٹک کر، چلے فقط دو قدم مٹک کر

تو جان دے گا تو سر پٹک کر، یہ فیصلہ سُن مری زباں سے!

وہ حسنِ بے باک و پاک دامن، سمجھ میں آئے گا کیا بیاں سے!

جمالِ رُخ بے مثال اُس کا، ہے حُسنِ یُوسف کے خانداں سے!

بچھے ہیں زلفوں کے دام ہر سو، نہ چھوڑ ظلمت میں مرغِ دل کو

چراغ بجھنے نہ دے خرد کا، سنبھل کے چل کوچۂ بُتاں سے!

وہ عشوہ آئیں! وہ رشکِ نسریں! خدا کی صنعت کا اک نمونہ!

تو اُس کا حسن و جمال کیونکر، بیاں ہو تشبیہ کی زباں سے

اُتر سکے گا نہ عکس ہرگز، بتوں کا آئینۂ سخن میں

شبیہِ لیلےٰ نظر نہ آئی، کبھی عبارت کے پیرہن میں

باب (۵)

زید کا عشق اور عشق میں اضطراب

یہ شعلۂ حُسن میں نے دیکھا، نہ پُوچھ پھر حالِ زار میرا

کہ دل کے آتشکدے کا نقشہ، عیاں نہ ہوگا کبھی بیاں سے!

چکھی تھی "سوزِ دروں" کی لذّت، ہوا تھا دل دشمنِ فراغت

شکیب و عزم و ثبات غائب! پڑا تھا پالا مجھے فغاں سے

جو روکے میں بار بار ہنستا، تو ہنس کے پھر زار زار روتا

دماغ وارو نہ ہو گیا تھا، شکستِ قلب و فشارِ جاں سے

"سُن[1] اے صنم تو ہی مستحق ہے، کہ تجھ پہ قرباں ہو دین و دُنیا"

یہ کلمہ پڑھتا تھا میں عشائک، جو چونکتا صبح کی اذاں سے

---

[1] کلمۂ عشقِ حقیقی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

کلمۂ عشقِ مجازی مذکورۂ فوق۔

مقابلہ یار کے دہن کا ، میں روز کرتا کلی کلی سے
دمِ سحر جا کے توڑ لاتا، تمام غنچوں کو گلستاں سے
شگاف پڑتے تھے آسماں میں، جو نالے کرتا تھا میں مدام!
زمیں کو رنگِ حنا ملا تھا، مگر میری چشمِ خونچکاں سے!
یہ آتشِ عشقِ یارِ خاکی، نفوسِ سرکش کی اک سزا ہے
لگائے لَو کوئی اپنے رب سے، کہ دیکھ لے اس میں کیا مزا ہے

باب (۶)

زید ابرازِ عشق کے لئے محبوب کے گھر جاتا ہے

گیا میں اُس مہ جبیں کے در پر، پیام دینے دلِ حزیں کا
کہ عشق اور حُسن ہمنفس ہوں، حجاب اُٹھ جائے درمیاں سے
بہائے گو میں نے لاکھ آنسو، قریب تر اُس کے آستاں سے
مگر ستمگر نے یہ نہ پوچھا، کہ کون ہو، آئے ہو کہاں سے ؟
پھرا ہوا اُس کا رُخ جو دیکھا، تو میں دبے پاؤں لوٹ آیا
گیا تو تھا دل کی بات کہنے، نہ بات نکلی کوئی زباں سے
یہ کیسا بے درد ہے زمانہ! کہاں گیا ہائے وہ زمانہ!
کہ بات بنتی تھی عاشقوں کی، تملق و شکوہ و فغاں سے
خدا ہی اُن شاعروں سے پوچھے، جنہوں نے اِن بے وفا بُتوں کو
زمیں کی خاشاک سے اُٹھا کر، ملا دیا سطحِ آسماں سے!

جو برق تڑپے، جو ابر روئے، اُٹھے جو طوفانِ نوح یارب!

تو دم کے دم میں تمام کوچے، بُتوں کے نابود ہوں جہاں سے!

کوئی پرستارانِ بتوں کا، بُرا نہ مانے، رمیدہ ہوں میں!

نکل گئی بے خودی میں واللہ، بد دُعا یہ میری زباں سے

عذاب ہے اُلفتِ مجازی، نہیں علاقہ اِسے خدا سے

یہ نفسِ سرکش کی کور ذوقی، ہے علم و اِدراک کی خطا سے

باب (۷)

زید ایک عاشق کی حیثیت سے غور کرتا ہے کہ عشق اور جنوں میں کیا فرق ہے۔

کہاں فلاطوں جو اُس سے پوچھوں، کہ فرقِ عشق و جنوں میں کیا ہے

اگرچہ مانا کہ مرتبے میں، جنوں ہے کم عشقِ پارسا سے!

جُنوں سے افکار میں تصادُم، تو عشق سے رُوح میں تلاطُم

جنوں کی ہر لحظہ سو ترنگیں، وجودِ عشق ایک آشنا سے!

جنوں تصوّر کے پَر لگا کر، اُڑے شیاطیں کی انجمن میں

تو عشق امواجِ بحرِ غم پر، بہے تاثّر کے اقتضا سے

جنوں کی زنجیر میں خرابی، وصال میں عشق کی تباہی

جُدا جُدا راہ کے یہ راہی، کہ ان کے حق میں دُعا خدا سے!

تڑپ میں گویا ہے عشق پارا، بھڑک میں اپنی جنوں شرارا

اٹل ہیں دونوں مثالِ خارا، عمل میں آزاد اِبتدا سے

جو شنگ و شوخ و سُبک جنوں ہے، تو عشق حیران و سرنگوں ہے
بلاکشی میں ہے عشق برتر، جنونِ بے درد و فتنہ زا سے

جنوں کی فطرت تباہ کاری، جبلّتِ عشق جاں سپاری
جنوں دغاباز، عشق مخلص، بنا ہے یہ مایۂ وفا سے

مرض یہ ہیں گرچہ بھائی بھائی، مگر نہیں ان میں ہمنوائی
افاقہ دونوں کو ہو دُعا سے، غرض نہیں عشق کو دوا سے

جنوں سُبک بال اگر ہو ہمدم، تو اس پہ قرباں ہو عقلِ پُر غم
نہ رنجِ دُنیا، نہ فکرِ عقبیٰ، نجات پائے تو ہر بلا سے

خجستہ[51] فرجام وہ جنوں ہے، جو عشقِ حق سے ہوا ہے پیدا
خرد بھی بیٹھی ہے سر بزانو، کہ معجزات اس سے ہیں ہویدا

---

۵۱ خجستہ فرجام = جس کا انجام نیک اور مبارک ہو۔

باب (۸)

شبِ ہجر عشق میں ناکامی زید کے دل میں خدا کی یاد تازہ کرتی ہے۔ اور وہ دُعا کرتا ہے۔

میں اس کی فرقت میں یوں تھا بے تاب، جیسے بے آب کوئی ماہی
فغاں میں گزری تھی رات ساری، کھڑی تھی پیشِ نظر تباہی

اُسی کو ہے لُطفِ زیست حاصل، جو مست ہو بادۂ غِنا میں
اگر میسّر ہو بے نیازی، تو ہے فقیری بھی پادشاہی

جمالِ انساں بقولِ جوزیؒ[52]، علامتِ حُمق و سفلگی ہے
تو پھر حسینوں پہ اے ستمکش، نہ پھونک اپنا فسونِ آہی!

قدم قدم پر ہے موت اس کی، جو منزلِ عشق کا ہو راہی
نہ بھول حلاّج کی شہادت، نہ بھول فرہاد کی گواہی!

---

۵۲ دیکھئے جوزی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف = اَلحَمقیٰ وَالمُغَفَّلِین

دُعا تھی "طالب ہوں اس صنم کا، نہ دے تو طبل و علَمِ الٰہی!

میں عشق کی فوج کا سپاہی، نہیں مجھے شوقِ پادشاہی

مراد بر آئے دل کی یارب! تو پھر نہ تجھ سے رہے شکایت

اگرچہ تا حال میری دُرگت، بنائی جس طرح تو نے چاہی

یہی ہے منظور کیا الٰہی، کہ تڑپے عاصی مثالِ ماہی!

دُعائیں مقبول ہوں اُسی کی، جسے ہو مقدور بے گناہی

میں التجا کوئی تجھ سے کرتا، تو تیرے در سے جواب ملتا

کہ اے زیاں کار! کور باطن! نہ مانگ اپنے لئے تباہی!

نہیں ترے دل میں نورِ عرفاں، فقط جہالت کی ہے سیاہی!

تجھی میں ہے ذوقِ شر نوازی، نہ تجھ سے ہو اپنی خیر خواہی!

مجھے ستاتا ضمیر میرا، کہ ہے وہ اک ترجمان تیرا

مچل مچل کر سُنائے جاتا، کبھی اَوامر، کبھی نَواہی

جو کنجِ عزلت میں خوب روتا، تو مُسکراتا میں انجمن میں

جہانِ بدخو کے ساتھ یارب! تحمّل و صبر سے نباہی

لکھی ہے قسمت میں پائمالی، تو کس سے شکوہ کروں الٰہی

ریاضِ ہستی میں مَیں بھی گویا، ہوں مورِ بے مایۂ گیاہی!

میں سامنے تیرے جُھک رہا ہوں، جُھکا مِرے سامنے جہاں کو

یقیں ہو مجھ کو کہ تیری عظمت، عبث نہ تھی آجتک سراہی

مِری مناجات تھی ادھوری، کہ گوشِ دل میں صدا یہ آئی

کہ "اے ستمکش نہیں ہے زیبا، تجھے یہ اندازِ خانقاہی"!

اُسی فرشتے کی یہ صدا تھی، جو گرمِ پیکار ہے بشر سے!

ندا یہ ابلیس کی تھی ہمدم، بچائے اللہ اُس کے شر سے!

باب (۹)

ابلیس کا ورود اور زید کے گوشِ دل میں اس کا خطبۂ دوم

کہا عزازیل نے کہ "ہمدم، عبث تھا یہ گریۂ زنانہ!
تگ و دوِ عشق سے نہ گھبرا، نہ بیٹھ ہو کر رہینِ خانہ
نہیں محبت کا کھیل آساں، کہ اس کی لذت ہے آنسوؤں سے
ہوا ہے عاشق کے خوں سے رنگیں، ہر الفت و عشق کا فسانہ
جو سچے عشاق ہیں جہاں میں، وہ محو ہیں نالہ و فغاں میں
فیوض ہیں "سوزشِ نہاں" میں، جنہیں نہیں جانتا زمانہ
نہ بھول، تھا قیس لاابالی، خیالِ سود و زیاں سے خالی
زمیں کا فرش اس کا تھا بچھونا، تو آسماں اس کا شامیانہ
کمالِ الفت عذابِ جاں ہے، عذابِ جاں میں خوشی نہاں ہے،
خوشی کی خاطر تری فغاں ہے، فغاں ہی الفت کا ہے فسانہ!

نہ ہو محبت، عذاب و آفت، تو وصل میں کیا رہے گی لذت
نہیں اس الفت کی کوئی قیمت، نہ جس میں ہو شیونِ شبانہ!
تو شاد ہو قولِ رند سن کر، کہ عشق بھی ہے جہادِ اکبر
اگر نہ ہو رام ماہ پیکر، حرام عاشق پہ آب و دانہ!
تو دیکھ لے سوز و سازِ عاشق، کبھی وہ گریاں کبھی ہے عریاں
کہ عشق بازی ہے جانسپاری، نہیں کوئی شغلِ بچگانہ
غریب عاشق کا دل غنی ہے، ملی اگر اس کو پدمنی ہے
اچھل کے ٹھوکر سے وہ اڑا دے، ملے جو قارون کا خزانہ
دیارِ الفت میں کارِ عاشق، ہے کوہ سے جوئے شیر لانا
جو یار اسے بزم سے اٹھا دے، تو ہے یہی اس کا محنتانہ
دریدہ اب تک نہ تیرا داماں، نہ چاک اب تک ترا گریباں
کہاں ہے وہ عشقِ فتنہ ساماں جو چھین لے تجھ سے آب و دانہ؟
نہ تجھ کو شوقِ برہنہ پائی، نہ تجھ میں ہے ذوقِ رہ نشینی!
یہ عشق تیرا ہے اک تماشا، کہ جس پہ ہنستا رہے زمانہ

نہ سینہ کاوی سے تجھ کو لذّت، نہ جانفشانی سے تجھ کو اُلفت

گذار دی تو نے عمر لیکن، پڑھا نہ فرہاد کا فسانہ

ہنوز سودا ہے خام تیرا، بنے گا کس طرح کام تیرا

نہ ہو وہ جب تک غلام تیرا، نہ چھوڑ تو اُس کا آستانہ

طواف ہے اُس کے گھر کا لازم، کر اس کے قدموں پہ جبہ سائی

خدنگ آہوں کے پھینکتا جا، کہ ہو وہ اک دن ترا نشانہ

نظارہ کر بار بار اُس کا، کہیں نہ ہو سُست عشق تیرا

سمندِ اُلفت کو چُست کر دے، جمالِ شاہد کا تازیانہ

جو بُعد غارت گرِ محبّت، تو قُرب ہے جذب کا معاون

یہی ہے آئینِ کارِ قدرت، نہ چھوڑ تو اُس کا آستانہ

حضور رہے اُس کے در پہ لازم، تو دیکھ مُرغِ چمن کو ہمدم!

کہ گل کے سایہ میں کس خوشی سے، بنا رہا ہے وہ آشیانہ

مفادِ نفس و فریب و حکمت، ہوں پیشوا تیرے ہر عمل کے

یہی ہے وہ علم جس کے بل پر، چلا ہے دُنیا کا کارخانہ

اُسی کا اک شعبہ ہے سیاست، کہ جس سے چلتی ہے ہر ریاست

تو دیکھتا جا اس آئنہ میں، رموزِ کردارِ خُسروانہ!

ہُنر یہ واعظ سے سیکھ لینا، کہ بزم کو کس طرح لُبھانا

نشے کی حُرمت پہ وعظ دینا، چڑھا کے جامِ مئے مُغانہ!

ہزار مکر و فریب دل میں، تو آستیں میں چھُری چھُپائے

ہمیشہ محفل میں پھیرتا جا، تو اپنی تسبیحِ سُرخ دانہ!

جو کوئی پوچھے، کہاں چلے ہو، پہن کے پوشاکِ صوفیانہ

تو لے کے مسجد کا نام فوراً، ہو میکدے کی طرف روانہ!

عُدو کے گُن محفلوں میں گانا، اور اُن کی حاجت میں کام آنا

کہ مرغ بھی دام میں نہ آئے، جو ہو نہ موجود اُس میں دانہ!

دروغ و مکر و فریب سازی، ہیں عشق و جنگ و جدل میں جائز

حصُولِ مقصد اگر ہو ممکن، تو ہے روا حیلہ و بہانہ

جو فتح و نُصرت کی آرزو ہو، تو سیکھ جذبات کو چھُپانا

عدو کو ہنس کر گلے لگانا، بہ صد تمنّائے قاتلانہ!

ہوا ہو دِل کفر کا خزانہ، تو گائے جا دین کا ترانہ!

یہ پیشہ گو ہے منافقانہ، پر اس سے ملتا ہے آب و دانہ!

نہ راہ رو ہو سنبھل سنبھل کر، قدم قدم رکھ پھسل پھسل کر

مچل مچل دِل مسل مسل کر، یہی ہے اندازِ عاشقانہ

اگرچہ تلبیسِ فن ہے مشکل، بنائے گی مشق تجھ کو کامل

جو رہ گیا اس ہنر میں جاہل، اُسے نہیں مانتا زمانہ"

جہاں میں ابلیس ممتحن ہے، خدا کے عملے میں ہے وہ شامل!

بغیر اُس کے ہے غیر ممکن، کہ کوئی عامل ہو مردِ کامل!

باب (۱۰)

عبادت اور دُعا کے فیوض و برکات - زید پہلے ان سے واقف نہ تھا - اور اس کے متعلق آیندہ بند میں اسکے اشارات ہیں

فیوض و برکات، کیا بتاؤں، عبادت و بندگی کے ہمدم!

کہ ہفت گردوں کے سارے انجم، انھیں کے اثرات سے ہیں محکم

عبادت آتش زنِ معاصی، تو معصیت رہزنِ عبادت

یہ راز توفیقِ نیک و بد کے بتائیں ربِّ جہاں کے محرم

غذائے رُوحِ بشر، عبادت! سزائے نفسِ اثر، ریاضت!

نہ ہوگا آئینہ دل کا روشن، اگر نہ جاری ہو سعی پیہم!

حیاتِ دل عشقِ پاکِ یزداں، مماتِ دل کفر و اثم و عدواں

ثباتِ[۱] دل، نشۂ توکل، کہ دل اسی مے سے ہے مست و بیغم

۱؎ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ - سورۃ الطلاق - آیت ۲

جمالِ دل، صبر و صدق و اُلفت، جلالِ دل، خواہشِ شہادت

زوالِ دل، کذب و حرص و کینہ، وبالِ دل، آتشِ جہنم!

فسونِ لیلائے شب کے باعث، خموش ہوتا ہے جب یہ عالم

تو روحِ مستِ مئے عبادت، بھی رقص کرتی ہے خوب اُس دم!

دل[1] و زباں سے ہو ذکرِ رحمٰں، تو ٹوٹ جائے طلسمِ شیطاں!

عبادت، ایمان، اور توکّل ہیں پاسباں تیرے دل کے ہمدم!

اگر[2] کہے کوئی، "پارسا ہوں، بغیرِ خوفِ خدا کے ہر دم"

تو اِدّعا یہ ہے بے سروپا، کر اس کے علم و خرد کا ماتم!

ضمیرِ انساں ہیں فتنہ جوئی، رکوع و سجدہ گناہ شوئی

محال ہے یہ کہ بے عبادت ملے خدائے اجلّ و اکرم!

---

[1] اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ

(سورۃ النحل ۱۶ آیت ۹۹)

[2] وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ

(سورۃ الزخرف ۴۳ آیت ۳۶)

یہی[1] کشاکش ہے زندگی کی، اُدھر ہے ابلیس اِدھر ہے آدم

جو بندہ ابلیس کو پچھاڑے، نگاہِ یزداں میں وہ ہے رستم

مٹائے گی دل سے لوثِ عصیاں، اُسی طرح گرمیٔ عبادت[2]

تمازتِ آفتاب جیسے، مٹائے غنچہ کے مُنہ سے شبنم!

نہ پھر تسلی کی جستجو میں، نہیں وہ دنیائے رنگ و بو میں

نہالِ ایماں کے اس ثمر کو، تلاش کر باغِ دل میں ہمدم!

قضا لرزتی رہے دعا سے، کہ خود ہی ٹلتی ہے یہ خدا سے

دعا وہ لیلیٰ ہے جس کا شیدا، ازل سے ہے، لطفِ ربِّ اکرم!

فضول[3] ہے بحث بے خبر سے، خدا کا پیماں ہے بشر سے

کہ ہم کو مضطر اگر پکارے، جواب دیں گے ضرور اسے ہم!

---

[1] وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا (سورۃ النساء ۴ - آیت ۳۸)

[2] اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (سورۃ الملک آیت ۲)

[3] اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ الخ سورۃ النمل۔ آیت ۶۲ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ الخ

سورۃ البقرہ آیت ۱۸۶

فقیر[1] سجدہ میں سر جھکائے، دُعا سے عرشِ بریں ہلائے!

سپاہِ ابلیس کانپ جائے، عدوئے آدم ہو وقفِ ماتم!

دُعا سے صبر و سکوں ہے پیدا، فسردہ ہو دل کہ چشم پُرنم

نہ مِل سکا کافرِ حزیں کو، کبھی یہ زخمِ جگر کا مرہم!

بگڑ چکے ہیں جو کام لاکھوں، سنورتے ہیں پھر دُعا کے دم سے!

قرار پاتے ہیں رفتہ رفتہ، جو دل ہیں بیتاب سوزِ غم سے!

اس باب کے پہلے شعر سے متعلق ذیل کی آیتیں دیکھئے۔ سورۃ النجم۔ آیت ۱۸۔ سورۃ رحمٰن آیت ۹۔

---

[1] فقیر سے مراد زید نہیں، بلکہ ہر فقیر۔

باب (۱۱)

زید کی نگاہ میں تصویرِ جوانی ۔ اور اس کا اعتراف کہ عنفوانِ شباب میں وہ عبادت کے فیوض و برکات سے آگاہ نہ تھا۔

فیوض و برکات بندگی کے، بتا دئے چند تجھ کو لیکن

نہ پہلے میں ان سے آشنا تھا، نہ ان کو مجھ سے تھی آشنائی

ہوئی تھی نیروئے فکر خود سر، بنی تھی جذبات کی وہ رہبر

نقاب تھا آگہی کے مُنہ پر، شباب میرا تھا ابتدائی

ثواب اور ناثواب کیا ہے، جو کہہ سکے وہ شباب کیا ہے؟

شباب کی وہ شراب کیا ہے، نہ جس میں مستی نہ خود نمائی؟

میں اپنے علم و ہُنر پہ نازاں، اور اپنے ادراک پر تھا قرباں

یہ وصف تینوں تھے میرے ہمدم، غرور و پندار و خود ستائی؟

وہی ہے موجود جو ہے مرئی، نہیں ہے موجود غیر مرئی

یہیں تلک تھی نظر کی وسعت، یہیں تلک فکر کی رسائی؟

فقیر، سقراط مِرے آگے، حقیر، بقراط پیچھے پیچھے
غرض تصوّر نے مجھ کو دی تھی، کئی حکیموں کی پیشوائی!

وہ خوابِ خرگوش کا زمانہ! نہ تھا وہ کچھ ہوش کا زمانہ!
خدا کو پہچانتا میں کیونکر؟ کہاں خدا اور کدھر خدائی!

زہے جوانی کہ اس کے دم سے، ہے طمطراقِ سرائے فانی!
سرائے فانی پہ چھائے پیری، تو جلد بگڑے بنی بنائی!

مگر زمانہ ہے برق جولاں، نگاہ میں اسکی دونوں یکساں
حبابِ دریا کی خوش ادائی، شباب کی ہیئتِ کذائی!

صد آفریں تجھ پہ اے جوانی! سراب میں کر تلاش پانی
تو چاہتی ہے کہ کوہِ غم سے، بہا کرے جوئے شادمانی

باب (۱۲)

ابلیس کی ہدایت کے مطابق زید کا عمل۔ حصولِ مرام کے لئے اس کی جد و جہد۔ اس سلسلہ میں محبوب کے باغباں سے اس کی ملاقات، اور باغباں سے تملق آمیز باتیں

میں اس تفکّر میں گھل رہا تھا، کہ یار تک کیسے ہو رسائی
سُنا تھا ابلیس کا یہ فرماں "کر اُس کے قدموں پہ جبہ سائی"

اچانک ابلیسِ کارداں نے، کیا مِری عقل کو اشارہ
کہ ہو گی مخدوم تک رسائی، اگر ہو خادم سے آشنائی!

اشارہ پا کر مکاں سے نکلا، ملا میں گلرو کے باغباں سے
اگرچہ یہ کام بھی تھا مشکل، جنوں نے ہمّت مِری بندھائی

ہُنر خوشامد کا گو ہے مشکل، مجھے ہے اسمیں کمال حاصل!
سُنی مزے لے کے باغباں نے، یہ میری تقریرِ ابتدائی

بیاں کی یوں طرح میں نے ڈالی، کہ اے طبیعت نواز مالی
سعید ہے شغلِ باغبانی، کہ اسکے باعث ہے دلکشائی!

جہاں میں معصوم جب تھا انساں، اور اس کا احوال تحتِ[1] عُریاں
تو وہ کشاورز[2] و باغباں تھا، یہی تھا شغل اس کا ابتدائی

غریب آدم کے نیک بچے، عمل میں اچھے زباں کے سچے
خداشناسی میں تھے نہ کچے، کبھی انہوں نے نہ کی گدائی

ہمیشہ باغات ہی سے زینت، رہی ہے دُنیائے رنگ و بو میں
اگر نہ ہوں باغباں جہاں میں، تو کیا رہے انہیں خوشنمائی!

شکستہ دل، فیلسوف، شاعر، ولی، شقی، شیفتہ، مسافر
کلاہ بردار[3]، دزد، تاجر، طبیب، قوال، کیمیائی

امیر مستِ شرابِ عشرت، فقیر وقفِ عذابِ حسرت
غرض کہ ہر کس بقدرِ ہمت، رہا ہے باغات کا فدائی

جگر ہمارے ہیں داغ والے، تو کیوں مزاحم ہوں باغ والے
جو پاس لا کے بیٹھ کر ہم، کریں گھڑی بھر سخن سرائی

زمیں کے معصوم اُگنے والے، جو رزق پاتے ہیں تیرے ہاتھوں
بلند کتنا ہے تیرا رتبہ، خدا نے دی ہے تجھے خدائی!

لہ، ٢ہ، ٣ہ حاشیہ ص٣٦ پر دیکھیے۔

دُعائیں دیتے ہیں تجھ کو دل سے، ہر ایک بھرے نخل اس چمن کے
ترے سوا آج تک کسی نے، نہ پیاس ان کی کبھی بجھائی

دراز ہو تیری عمر مالی! کہ تو ہے اس گلستاں کا والی
تری رفاقت حیات اس کی، ممات اس کی تری جدائی

تو جانتا ہے کہ عشق کیا ہے، فغانِ بُلبل سے آشنا ہے
کہ اس کو بیتاب کر رہی ہے، گلِ شگفتہ کی دلربائی

مرے بھی دل میں ہو دردِ پنہاں، مثالِ بُلبل ہوں میں بھی نالاں
جمال سے ایک گلجبیں کے، ہوئی ہو جس دن سے آشنائی

پس اے نکوخواہ گلشن آرا، ہے تو ہی اک چارہ ساز میرا
تجھی سے امیدِ رہنمائی، تجھی سے ہو گی گرہ کشائی!

بتاؤں وہ کون دلربا ہے، جو دِل مرا چھین لے گیا ہے؟
تو جس کے گلزار کا ہے مالی، اُسی کی صورت کا ہوں فدائی!

مجھے مِلا دے تو میری جاں سے، تجھے بتاؤں میں کس زباں سے
کہ کام آئے گی آخرت میں، جو تو نے دنیا میں لی بھلائی

نہیں[۴] خردمند میں حماقت، مگر کہاں سمیں تابِ طاقت !

کہ خوش نہ ہو سُن کے اپنی مدحت، ہو جس میں شیرینیِ صداقت!

ص۳۴ سے متعلق

۱ے لُخت - کھلا، ننگا، صاف نظر آنے والا

۲ے کشاورز - کسان کھیتی کرنے والا -

۳ے کلاہ بردار - اُچکا، فریبی، دغاباز

مذکورہ بالا الفاظ، ایران میں خاص وعام کی زبان پر ہیں -

۴ے سمجھدار لوگ خوشامد پسند نہیں ہوتے - لیکن کوئی کتنا ہی بڑا فیلسوف و مفکر کیوں نہ ہو وہ اپنی تعریف و توصیف، جس میں صداقت ہو، سن کر محظوظ ہوتا ہے

باب (۱۳)

بسیارگو باغباں کا جواب، زید سے اُس کی نصیحت آمیز باتیں، امیرزادوں کی بداخلاقی کا شکوہ، اپنی ناداری کا گلہ، وغیرہ

سُنی یہ باتیں جو باغباں نے، تو پان اک ڈال کر دہاں میں

اُڑا کے پیک اُسکی ایک جانب، بیاں کی تمہید یوں اُٹھائی

کہا کہ "واللہ کیا اثر ہے، حضور کی موہنی زباں میں !

اگر یہ ڈورے عدو پہ ڈالے، تو وہ بھی ہو آپ کا فدائی

بُرا نہ سرکار مانیے گا، امیرزادوں کو جانتا ہوں

انھیں کے باغوں میں عمر اپنی، گزار دی میں نے دو تہائی

نہ جانے کب ان سے ہو رہائی، خدا! عجب ہے تری خدائی!

یہ عیش دِن رات کر رہے ہیں، اڑا کے مزدور کی کمائی

امیرزادہ ہے بے مروّت، نہیں ہے بیوی سے اس کو اُلفت

ہمیشہ آنسو بہا رہی ہے، وہ دیکھ کر اُس کی بیوفائی!

پری سی بیگم ہے گرچہ گھر میں، نہیں وہ جچتی مگر نظر میں
یہ سیرگاہوں پہ گھومتا ہے، کہ کوئی بِٹیا مِلے پرائی
کہاں ہے پچھر، کدھر ہے لچھر، مِلے گی کِس کی حسین دُختر؟
تلاش اس کو یہی ہے دِن بھر، کہ ختم چوری کی ہو کمائی
غریب بیوی کے دل میں دُکھ ہو، کہ گھر میں ہر بات کا تو سُکھ ہے
مگر میاں اُس سے خوش نہیں ہیں، وہ اک پڑوسن کے ہیں فدائی
وہ پدمِنی[1] ہو کہ چِترنی ہو، وہ سنکھنی ہو کہ ہستِنی ہو!
غریب دُکھ جھیل کر مرے گی، جو اس کے گھر میں بیاہ آئی!
مگن ہے یہ اپنی دھُن میں ہر دم، غریب بیگم کا اِس کو کیا غم!
وہ خاک میں مِل رہے گی لیکن جو اُس سے ہو کوئی بیوفائی!
یہ اس کا باہر کمال دیکھا، تو گھر میں کچھ اور حال دیکھا
کہ جنگ بیگم سے کر رہا ہے "بتا تو چلمن یہ کیوں اُٹھائی"؟
وہ کہہ رہی ہے کہ "میرا ننھا، پھُدک کے باہر نکل گیا تھا"
جواب مِلتا ہے "مر گیا تھا"؟ اسی پہ خونخوار ہے لڑائی!

[1] حسن و جمال کے اعتبار سے عورتوں کے یہ چار درجے ہیں ان الفاظ کے تلفظات اکثر اردو فرہنگوں میں نہیں ملتے ہیں۔

بیاہ سے پہلے اِس جواں کے، تھے بول دُکھیا کے حق میں شیریں
یہ اگلی تقریر اسکی سُنیئے، مٹھاس میں، ہیچ ہے مٹھائی
"سفر سمندر کا جیسے جانی! اسی طرح ہے یہ زندگانی!
ہم ایک ہی ناؤ میں رہیں گے، کریں گے خود اس کی ناخدائی
یہ بحر مارا کرے گا موجیں، تو ہم بھی لیتے رہیں گے لہریں
اُڑائیں گے عیش اس سفر میں، اگر ہوا ہم کو راس آئی
نہ اپنے مابین غیر ہوگا، مگر سے دریا میں بیَر ہوگا
لپٹ کے ڈوبیں گے ہم، جو کشتی، بھنور میں تقدیر نے پھنسائی"
مگر ہیں دو کشتیوں میں اب یہ، جہاز بیوی کا ہے بھنور میں
میاں تو آنکھیں چُرا رہا ہے، یہ بے وفائی کہ بے حیائی؟
شباب، زر، اور تندرستی، ہیں پاس جس کے اُسی کے سر پہ
ہے عِشق کا جِن سوار اکثر، یہ بات بندے نے آزمائی!
امیر کا کھیل عِشق بازی، غریب بے چارہ ہے نمازی
مگر جو فاقوں سے مر رہا ہو، وہ صرف روٹی کا ہے فدائی!

یہ بھوک پاپی، بڑی بلا ہے، پچاس صوبوں کا حکمراں بھی
نہ پائے روٹی تو بھیک مانگے، ہزار ہو جائے جگ ہنسائی

میں جانتا ہوں کہ عاشقی نے حضور کو دُکھ دیا ہے لیکن
جو میرے دُکھ کو سمجھئے پربت، تو اپنے دُکھ کو سمجھئے رائی

مجھے جو تنخواہ مل رہی ہے، اسی میں پلتے ہیں سات بچے
کبھی تو سالن پہ اُنہیں اَن بَن، کبھی ہے اک نان پر لڑائی

کہاں سے بھوکوں میں ہو محبت، کہ ہے درندوں سی ان کی حالت
بہن جو بھائی کا حق اُڑائے، تو پھاڑ کھائے بہن کو بھائی!

جہاں کے جنجال میں پھنسا ہوں، گلے تلک قرض میں دھنسا ہوں
نہ چھ مہینے میں، میں ہنسا ہوں، نہ اہلیہ میری مُسکرائی!

بہت ہی بن ٹھن کے ایک بیوہ، کل اپنا زیور دکھانے آئی
مرے کلیجے پہ سانپ لوٹا، مری سہاگن جو تلملائی!

بچا کے رکھی تھی پائی پائی، کہ دینی درزی کو تھی سلائی
سو وہ بھی اک دوست نے چرائی، پکارتا ہے جو مجھ کو بھائی

مگر اس آفت پہ دم نہ مارا، کہ ہو نہ شرمندہ دوست پیارا
پُکارتا ہے وہ مجھ کو بھائی، میں کیوں کروں اس سے بیوفائی؟

فقیر اور میری زبانی، سُنی فقط ایک ہی کہانی
کہ آفت آئی جب آسمانی، تو پھر نہ اس سے نجات پائی

نہ پاس جس کے ہو ایک پائی، نہ کل سے روٹی ہو جس نے کھائی
وہ کیا کرے دھوپ میں کمائی! کہاں سے لائے وہ پارسائی؟

دُکھی ہیں لوگ اکثر اس جہاں میں، سُکھی ہے وہ[۵] جو ہے آسماں میں
کہاں ہے جاندار اس زمیں پر، نہ جاں کبھی جس کی تلملائی!

مگر ہے کچھ اور حال اپنا، نہیں جو تقدیر میں پنپنا
تو پھر خدا ہی کا نام جپنا، کہ آخرت کی ہے یہ کمائی!

مٹا لڑکپن، کٹی جوانی، پیا نہ غیروں کے گھر کا پانی
یہ آن میری ہے خاندانی، نہ مجھ سے پیری میں ہو گدائی

نہیں ہے دولت مجھے کمانی، نہیں مجھے سلطنت چلانی
ملے گی بھارت کی راجدھانی، ہے تب بھی مرنا جو موت آئی!

۵ یعنی خدا۔

مگر خدا قرض سے بچائے۔ کہ سچ ہے مقروض زہر کھائے!

مراد بر آئے یہ تو گویا، خوشی کی میراث دل نے پائی!

یہ میری قسمت کی ہے حکایت، نہ آپ سمجھیں اسے شکایت

خدا رکھے موت کو سلامت، جو دُکھ کے پنجے سے دے رہائی!

سُن اے فلاکت، عدوئے راحت! جہاں میں شکوہ ہی عام تیرا!

نوشتۂ بخت کے مطابق، عذاب دینا ہے کام تیرا!

باب (۱۴)

افلاس و نکبت کا شکوہ سُن کر

زید باغبان کی امداد کرتا ہے

ابھی تھا گرمِ فغاں وہ مالی، کہ ہاتھ میں اس کے میں نے رکھی

بہ سُرعتِ برق اپنی نقدی، جو اس کی ہو سال کی کمائی

بپا ہو جذبات میں تلاطم، تو رُخ پہ ہوتا ہے وہ نمایاں

عجب ہوا حال باغباں کا، جو یہ رقم اس نے مجھ سے پائی

نظر میں حیرت، زباں میں لکنت، لبوں میں سیماب وار حرکت

علامتیں یہ بتا رہی تھیں، کہ عقل اس کی تھی سٹپٹائی

رہی بڑی دیر ہم میں حجت، اُسے زرِ غیر سے تھی نفرت

یہ سُن کے آخر ہوا وہ راضی، "پکارتا ہوں میں تجھ کو بھائی"!

غریب نے اپنا سر جھکایا، کیا یہ محسوس میں نے اس دم

مرے عطیے نے، اس کے دل میں، مری محبت بہت بڑھائی

کہا ادب سے "حضور والا، جو شب کو تشریف لائیے گا!

تو اِس گلستاں میں دیکھئے گا، کہ اپنے خادم میں ہے وفائی"

جواب مبہم تھا باغباں کا، کہ اس میں اک داؤ تھا زباں کا

مگر یہ طے کر لیا جنوں نے، کہ شب کو ہو قسمت آزمائی

وہ سحرِ الحُسّاں کبھی نہ اُترا، چلا جو اہلِ وفا کے دِل پر

ہوا ہے کیا بند کوئی غنچہ، فسونِ بادِ صبا سے کِھل کر؟

باب (۱۵)

باغباں کی دعوت پر زید شب کو محبوب کے باغ میں جائے گا۔ وہ نہیں جانتا کہ وہاں کیا واقعہ پیش آنے والا ہے۔ وہ کبھی مایوس زندگی سے بیزار ہے، چاہتا ہے کہ خودکشی کرلے اور کبھی امید سے خوش ہے۔ یہ اس کے جذبات ہیں جنکی طرف اگلے بند میں اشارات ہیں۔

زید کا اضطراب

واہ رے تلقینِ ناصح، "صبر کر! آہیں نہ بھر!"

کیا خبر اِس کو کہ کیا ہے دردِ دل، سوزِ جگر!

کیوں نہ ہو اِنسان گردش میں، کہ اس کے واسطے

ہے زمیں گردش میں اور گردش میں ہیں شمس و قمر!

لہ تمام افسانہ ایک ہی بحر میں لکھا گیا ہے۔ لیکن اِس خیال سے کہ خوانندگانِ عزیز بحر کی یک نواختی سے تنگ نہ آجائیں۔ کہیں کہیں بحر بدل دی گئی ہے۔ یورپ کے اکثر شعراء نے جن میں شیکسپیر بھی شامل ہے ایسا کیا ہے۔

دائمی لطف و خوشی انسان کو حاصل نہیں

دن کو جو ہنستا رہا، روتا رہے گا رات بھر

جن کے دروازے پہ محتاجوں کا رہتا تھا ہجوم

وہ تلاشِ رزق میں اب پھر رہے ہیں دربدر

ہے غم آبادِ جہاں، انساں کا دارُالامتحاں

چلتے ہیں تیر اِبتلا کے، ہائے، مشتِ خاک پر!

بے وفائی و جفا، فقر و بلا، سقم و فنا

رنج و فکر و دردسے، کیوں وہ نہ ہو آشفتہ سر!

تخت و ایواں سے نہ انساں کو ملی آسودگی

کاش مِل کر خاک میں پائے وہ عیشِ منتظر!

خامشی کُنجِ لحد کی، میرا سامانِ سکوں

محفلِ گیتی! مبارک تجھ کو اپنا شور و شر!

زید کے دِل میں امید کے افکار
جِس سے اس کو اطمینان حاصِل ہوتا ہے

آہ! اے امید! اے قلب و جگر کی پاسباں!

اے معینِ پشتکار[1] و عزمِ ابنائے بشر!

تیرے دم سے نغمہ پیما ہے ربابِ زندگی

قصرِ گیتی کے، ترے پرتو سے، روشن بام و در!

تیرے بَل پر قیصر و کسریٰ نے کیں خونریزیاں

بارہا تو نے کیا نظمِ جہاں زیر و زبر!

تیری صہبا سے تغافل پیشہ بھی سرمست ہے

بوالہوس کے بزمِ دل میں تیرے دم سے شور و شر!

---

[1] ثابت قدمی

ہم‌نفس تجھ کو بتا کر راہبِ پیرانہ سر
دامنِ کہسار میں دن اپنے کرتا ہے بسر!

شادماں، اے مہروش! ہے مجرمِ تیرہ دروں
ظلمتِ زنداں میں بھی تیری شعاعیں دیکھ کر!

شفقتِ یزداں ہے تو، اے مادرِ صبر و سکوں!
زخمِ خونریزِ جگر پر، تیرا مرہم کارگر!

قطع اگر ہو تیرا رشتہ کافرِ غمناک سے
ہائے! خاک و خوں میں تڑپاتا ہے، وہ خود اپنا سر!

موت راہِ حق میں، لطفِ مومنانِ دیدہ ور
خودکشی معراجِ کفرِ کافرِ شوریدہ سر

خودکشی ہے بزدلی! گویا دمِ رزمِ حیات
ہے سپاہی کا گریز اپنے محل کو چھوڑ کر

ہر مسلماں کو الٰہی صبر کی توفیق دے!
جب چلیں تیرِ حوادث، ہنس کے ہو سینہ سپر

یاس ہے ہمت شکن، امید ہمت آفریں
ناامیدی لطفِ حق سے فتنۂ قلب و نظر

ہاں مگر بے باک ہے، توحید کے حامل کا دل
خندہ زن ہو کر، رسن کو چومتا ہے دار پر

عقل و تقویٰ جس کے حربے، وہ نہیں عجز آشنا
ہفت کشور ہوں اُدھر، وہ یکہ و تنہا اِدھر

مردِ کامل کے لئے، ہے کھیل پیکارِ حیات
عقل اس کی تیغ ہے، ایمان ہے اس کی سپر

حیطۂ ادراک سے باہر ہے عیشِ جاوداں
طائرِ نفس اُڑ کے جاتا ہے جہاں بے بال و پر

جب بیاباں میں نظر آتی ہے لیلئ امید
قیسِ دل جرأت نما ہوتا ہے ہر اک گام پر

اے ندیمِ دل! خرد کو تجھ پہ کیوں ہو اعتماد؟
خاک میں تو نے ملائے، کیسے کیسے نامور!

زندگی زندہ دلی ہے، یاس دل کی موت ہے

دل کو امیدوں سے بھر، یوں[1] موت سے پہلے نہ مر!

زندہ و پایندہ باش، اے لیلیِ محمل نشیں!

تو نہیں ہمدم، تو پھر، دُنیا کا قصہ مختصر!

زید کے متضاد افکار

وسوسے اُٹھتے ہیں دل میں، یا الٰہی، بار بار!

کیا ہے یہ تیرا جہاں، اور اس میں کیوں آیا ہوں میں؟

طالبِ راحت ہوں، راحت مجھ سے کیوں بیزار ہے؟

رنج سے وحشت مجھے، کیوں رنج کو بھایا ہوں میں؟

---

[1] "موت سے پہلے مر" حدیث ہے۔ لیکن یوں مایوس و شکستہ دل ہو کر موت سے پہلے نہ مر۔

سر بلند اعدا تو اُن کے در پہ میرا سر نگوں!

ایسا برگشتہ مقدّر ساتھ کیوں لایا ہوں میں؟

نفس کیا ہے؟ روح کیا ہے؟ کیا بلا اور راگ ہے؟

آہ ان تینوں کی آویزش سے گھبرایا ہوں میں!

ہاں! دکھاتا ہے مجھے، آئینۂ دل گاہ گاہ

کیا ہے یہ کون و مکاں، کس چیز کا سایا ہوں میں!

عقل کی بھونڈی سی صورت، اس میں آتی ہے نظر

نفس کو بھی اپنے دیکھا ہے، تو شرمایا ہوں میں!

۱

باب (۱۶)

باغباں سے ملاقات کرنے کے لئے زید رات کے وقت
گھر سے نکلتا ہے

غرض یہ جذبات کا تھا عالم، کبھی ہیں وقفِ ملال و ماتم
کبھی وہ افکارِ صوفیانہ، ملائیں انساں کو جو خدا سے

میں ڈھونڈتا موت کے وسائل، کبھی تھا دُنیائے دوں کا سائل
ہوئی تھی عقلِ سلیم زائل، ہجومِ افکارِ فتنہ زا سے

عذابِ فرقت سے دم نکلتا، امید سے جاں میں جان آتی
عجب کشاکش میں ہر نفس تھا، رہا میں زندہ تری دُعا سے!

میں قلبِ مضطر کو لیکے نکلا، دُعائیں کرتا ہوا خدا سے
کہ "اے مِرے کارساز مولا، ملا دے اس حورِ مہ لقا سے"

فلک پر اک چاند کا تھا ٹکڑا، مگر تھا پوشیدہ اُس کا مکھڑا
جھلک دکھاتا تھا گاہے گاہے، نکل کے وہ ابر کی رِدا سے

عروسِ شب نے سیاہ چادر، جہاں کے چہرے پہ ڈال دی تھی
ڈراونی بن گئی تھی ہر شے، جو دور تھی شمع کی ضیا سے

عمل وہ ابلیس کا تھا گویا، تھی گھات میں اس کی فوج ساری
کہ دام میں اپنے اُن کو لائے، جو دُور تھے رُشد و اہتدا سے

قریب میں باغباں کے پہنچا، وہ دیکھ کر مجھ کو مُسکرایا
مزاج پوچھا تو جھک کے بولا، کہ "فضل ہے آپ کی دُعا سے!"

"حضور کا جاں نثار خادم، دُعائیں کرتا رہا خدا سے
کہ آپ کو درد سے افاقہ، ہو آج اس باغ کی ہوا سے"

غرض مجھے راستہ دکھاتا، وہ لے گیا اپنے جھونپڑے میں
جو پاس صحنِ چمن کے، لیکن، قریب تر تھا حرم سرا سے

یہاں مجھے اُس نے لا بٹھایا، کہا کہ "ہے سامنے تماشا

جو دیکھ کر سکو خوش ہوں آنکھیں، تو ملیئے پھر اپنے دلربا سے"

یہ کہہ کے اُٹھا وہاں سے مالی، نگاہِ مرموز مجھ پہ ڈالی

نگاہ اس کی وہ پیار والی، جو میں نے دیکھی تھی ابتدا سے

محیط تھا چار سو اندھیرا، حریمِ مہوش میں تھا اُجالا

میں دامنِ تیرگی میں چھُپ کر، ہوا تھا محفوظ ہر بلا سے

نری خودی محض بے خودی ہے، کہ ہے پسِ مرگ ہوشیاری

نظر میں وسعت، عمل میں قدرت، خیال و دانش میں پختہ کاری

باب (۱۷)

باغباں کے جھونپڑے میں بیٹھ کر زید محبوب کی بزمِ نشاط
کا منظر دیکھتا ہے

یہ بزم پھولوں سے کیا سجی ہے، بساطِ عیش و طرب بچھی ہے!

"خوشی" کی شادی یہاں رچی ہے، خرد ہے بیہوش اس فضا سے!

یہ چند احباب کی ہے محفل، مذاقِ رندی ہے ان میں کامل

نہیں یہ دیر و حرم کے قائل، نہیں سروکار انھیں خدا سے!

طرب کے موجود ہیں وسائل، پلا کے کرتا ہے ہوش زائل

وہ ساقیِ مشتری شمائل، میں جس کا شیدا ہوں ابتدا سے

ہر ایک ان میں ہے مے کا سائل، نہیں تکلف کا ذوق حائل

پیالہ گردانِ نیم عریاں، ہے شادماں ان کی التجا سے

سیاہ کاروں کا ذوق کیا ہے، یہ شاد ہیں اپنی ہر خطا سے

زباں پر ان کے ہیں وہ مسائل، نہیں علاقہ جنہیں حیا سے!

وہ دین و شرعِ متیں کا حامل، خطیب اپنا ہوا ہمیں شامل
ہوئے تھے ہم مستفید اک دن، اسی کی تلقین کی صدا سے

تو ہو نہ غرقِ محیط[1] حیرت، اگر نہ واعظ ہیں پائے غیرت
وہ چیر کر پردہ ریا کو، ہلا ہے رندانِ بے حیا سے!

"ثوابِ اعمالِ صالحہ" پر، جو وعظ دیکر بھی سُکھ نہ پائے
تو کیوں نہ واعظ کو خستگی ہو، تزہُّدِ صبر آزما سے

وہ ریش سے اپنے کھیلتا ہے، اُچھال کر گل کو جھیلتا ہے
شراب گلگوں کے جام پیہم، چڑھا رہا ہے عجب ادا سے

کبھی وہ تکتا ہے روئے ساقی، کبھی پیالے کا دُردِ باقی
ہُوا ہے مفتون ہائے صوفی! انگار کی چشم سُرمہ سا سے

وہ ہاتھ ساقی کا چومتا ہے، عجب طریقے سے جھومتا ہے
یہ کیا تماشا ہے یا الٰہی؟ سوال کرتا ہوں میں خدا سے

عجائب آبادِ دہر میں ہے، مجھے تعجب کبھی دعا سے
کبھی وفا سے، کبھی جفا سے، کبھی صفا سے، کبھی ریا سے!

[1] دریا

ہوا ہے اب نغمہ سنج ساقی، نشاط میں کیا کسر ہے باقی!
سرود سے گوش ہے ملاقی، کہ لطف اٹھے روح کی غذا سے

زید کا محبوب ذیل کے اشعار گاتا ہے

گرمِ فریاد ہے اگر زاہد
کیوں ہو خاموش رندِ عشرت کوش؟

بتقاضائے مصلحت انساں
اپنا دل تھام کر رہے خاموش

خامشی بر محلِ نطق و بیاں
نہیں ہرگز دلیلِ عقل و ہوش

شیرِ خونخوار ہی سہی واعظ!
رندِ میخوار بھی نہیں خرگوش!

سُن دعا میری اور کہہ آمیں
کہ اجابت ہو اُس سے ہم آغوش!

رند کی دُعا

(جو ساقی گاتا ہے)

اے کہ ہے عام تیرا لطف و کرم
بحرِ رحمت میں تیرے جوش و خروش!

کر دے سر سبز باغہائے عِنَبْ
اور مئے ناب قسمتِ مے نوش!

چمنِ دہر میں پھلیں پھولیں
بادہ کش، بادہ ریز، بادہ فروش!

ذوقِ عشرت اگر ہو پیشا پیش!
عیش و مستی عقب میں دوش بدوش

سطحِ گیتی ہو بزم گاہِ طرب
اہلِ گیتی ہوں وقفِ نائے و نوش!

بزمِ رقص و سرود میں ساقی
جامِ صہبا بکف، سبو بر دوش!

خُم پہ خُم پی رہے ہوں اہلِ زمیں!
آسماں رس ہو شورِ نوشا نوش!

ہر طرف چھا رہی ہو مدہوشی
ہوش ہو جس کو دیکھ کر بیہوش

شاہدِ خوش خرام کی آمد
عاشقِ زار کی کھُلی آغوش!

وعظ مستی پہ دے جو پیرِ مغاں
وجد میں آئیں اس کے حلقہ بگوش

چوم لیں شرطِ احترام سے وہ
پیر و مرشد کی بادہ بُو پاپوش!

ہر بشر ہو جہاں کا مستِ الست
تا قیامت نہ اس کو آئے ہوش!

دھوم ہر سو مچی ہو رندی کی!
زاہدِ بد نصیب ہو روپوش!

ہو یہی نقشہ، جب تلک یہ جہاں
پی کے جامِ فنا نہ ہو خاموش!

یہ نغمۂ فاجرانہ سُن کر، ہوا ہے محفل پہ وجد طاری
نہ پُوچھ کس طرح گونجتی ہے، حرم سرا شورِ مرحبا سے
چھڑی ہے بحثِ عوام و اُلفت، ہے عشق کا ذکرِ خیر جاری
خطیبِ رطب اللّساں ہوا ہے اب اہلِ محفل کی التجا سے

عِشق پر واعظ کی تقریر

سُنو خمستاں کے پاسبانو! بتاؤں میں تم کو عشق کیا ہے
یہ اِک عطیّہ دلِ بشر کو، مِلا ہے درگاہِ کبریا سے
ہے عشق وجہِ نمودِ عالم، اسی سے قائم وجودِ عالم
مِلا یہ آبِ حیات جس کو، رہا وہ ناآشنا فنا سے

عذابِ دوزخ ہے قحطِ اُلفت، تو عشق ہے عیشِ اہلِ جنّت
اسی کے باعث ہے بے نیازی، فقیرِ کامل کو ماسوا سے
حوادثِ دہر ہیں شرارے، تو عشق گویا ہے بادِ صرصر
جلیں گی چنگاریاں وہ کیونکر، جو گرمِ پیکار ہوں ہوا سے؟
وہ عشق ہی کی دوا تھی جس سے، ہوا شفایاب قلبِ آدم
یہی ہے وہ دردِ رُوح پرور، نہ جائے گا جو کسی دوا سے
ثباتِ عشّاق میں تزلزل، محال ہے میرے ہمنشینو!
پیامِ صبر و شکیب ان کو، مِلا ہے شہدائے کربلا سے
نشاط کیا سوزِ عشق میں ہے، یہ کوئی ستیوں سے مِل کے پوچھے!
لپیٹ کے شعلوں سے مسکراتیں، جو اُٹھتے جلتی ہوئی چِتا سے!
کرامتِ عشق کیا بتاؤں، میں اپنا دل چیر کر دکھاؤں؟
جہاں نمائی میں خوب تر ہے، یہ جم کے جامِ جہاں نما سے!
نہ پوچھئے جذبِ عشق کیا ہے، کھِنچے گا خود حسن پاس اسکے!
اُسی طرح جیسے ہو کے بیتاب، کاہ کھِنچتی ہے کہرُبا سے!

بلند اقبال ہے وہ انساں، جو سوزِ الفت سے مضطرب ہے
عطا ہو تم کو بھی عشق یارو! مری دعا ہے یہی خدا سے!
سخی ہے دل عشق کی سخا سے، غنی ہے یہ عشق کی وفا سے
کھلے ہیں انسانیت کے جوہر، اسی جفاکار کی جفا سے!

خطیب سرگرم ہے بیاں میں، کہ پوچھتا یہ ہے ایک سائل
"کھلے ہیں کیا آپ کے بھی جوہر، کرامتِ عشقِ پُرجفا سے؟"
جواب دیتا ہے اس کو واعظ، چڑھا کے جامِ آبِ آتشیں کا
کہ "آہ! ذوقِ سخن ملا ہے، مجھے اسی حسن کی بلا سے!
میں جب سے اس کا ہوا ہوں شیدا، یہ وصف مجھ میں ہوا ہے پیدا
کہ شعر کہتا ہوں ارتجالاً، جو پاک ہوتا ہے ہر خطا سے!"
ہوا ہے یوں معترض وہ سائل، "سنائیے کچھ کلام اپنا
ہے بارِ اثبات مدعی پر، نتیجہ کیا محض ادعا سے"؟

لہ ساقی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

خطیب کہتا ہے مسکرا کر، اور اپنا منہ پونچھ کر قبا سے
"خطاب منظوم یہ ہے میرا، عرب کے اک مردِ خود ستا سے"

متنبی کی روح سے واعظ کا خطاب

اے سخن گسترِ کوفی متنبیِ حجاز
کوئی شعرائے عرب میں نہیں تیرا ہمسر
تیری محنت سے سنورتی رہی لیلائے سخن
اس کے پیکر پہ دلاویز ہے تیرا زیور!
شوق سے محفلِ اربابِ ادب نے لوٹے
تیرے خامے نے گرائے جو معانی کے گہر
اب کہاں بزمِ عرب میں ترا اسلوبِ بیاں!
فکر و الفاظ ترے شعر میں ہیں شیر و شکر
تیرے اشعار کا ہر لفظ بقولِ غالبؔ
ہوا گنجینۂ معنی کا طلسم اکبر!

کاش رہتا نہ ترے دامنِ ناموس پہ داغ
مدعی اپنی نبوت کا ہوا تو کیونکر؟

تجھ[1] میں ایماں، نہ تزہّد، نہ توکّل نہ عمل
تجھ کو محرومیِ ہمدردیِ ابنائے بشر
تو نہ پابندِ صلوٰت و رَمَضان و قرآں
نہ ترے دل پہ محمدؐ کے فضائل کا اثر
تا دمِ مرگ، تو مستِ مےِ پندار رہا
بخل و خسّت میں نہیں آج بھی تیرا ہمسر

---

[1] کہتے ہیں کہ متنبّی میں تین اچھی اور تین بُری خصلتیں تھیں، بُری خصلتیں یہ تھیں کہ وہ نماز روزے کا پابند نہ تھا، اور نہ قرآن شریف پڑھتا تھا۔ اس کے کبر و نخوت اور خسّت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ کوفہ میں پیدا ہوا، سقّے کا لڑکا تھا، آخر دشمنوں کی شمشیر سے مقتول ہوا۔ اُس میں تین اچھی صفتیں یہ تھیں کہ وہ کذب، ریا اور لواطت سے پرہیز کرتا تھا۔

مشغلہ تیرا فقط مدحتِ سیف الدولہ
ہجوِ اعدا و ثنائے اُمرا تیرا ہنر
محفل افروز رہی گرچہ تری شمعِ خرد
خانۂ دل میں ترے اسکی ضیا تھی نہ مگر
یہ فضائل ترے، اے شاعرِ غرّائے عرب!
مُدعی اپنی نبوّت کا ہوا تو کیونکر؟

متنبّی ہو کہ ہو مانیِ ارژنگِ قدیم[1]
کبھی برُہان رسالت کی نہیں علم و ہنر

---

[1] متنبّی کی طرح مانی نے بھی نبوّت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا۔ وہ بے نظیر نقّاش تھا۔ اور نقاشی کو اپنا معجزہ بتاتا تھا۔ ارژنگ یا تو اُس کے مکان کا نام تھا جس میں اُس کے نقّاشی کے نمونے نمائش کے لئے رکھے ہوئے تھے یا اُس کی تصنیف کا نام۔ اُس کی متموّل بیوی نے اپنی ساری دولت اُس کے لئے ورثہ میں چھوڑی تھی۔ آردشیر یا بہرام شاہ کے حکم سے مقتول ہوا۔ اُس کی تعلیم یہ تھی کہ ہر چیز کا سرچشمہ نور و ظلمت یا خیر و شر ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مانی نام کی دو جدا شخصیتیں ہیں۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شاعری دُور نبوت سے ہے لاکھوں فرسخ
فرش پر شمع ہے، عرشِ بریں پر اختر
نور و فرمانِ الٰہی سے نبوت کی نمود
شاعری فکر و نظر اور بیاں کا منتر
شعر جذبات سے ہیں، جذبہ ہے زنجیریٔ نفس
نفس بد جو ہو، تو اشعار ہوں اس سے بدتر
اُوِڈ[1] رومؔ، وہ گردونِ ادب کا اختر!
گو تھا شاعر، مگر آتش زنِ اخلاقِ بشر

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) اکثر تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ مانی نے عیسٰی علیہ السلام کے بعد نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا۔

[1] اووِڈ (Ovid) وہ رومی شاعر جو قبل از عیسٰی علیہ السلام پیدا ہوا شہنشاہ آغسطس نے اُس کی اخلاق سوز شاعری کی وجہ سے اُسے شہر بدر کر دیا تھا۔ اس کا بے نظیر کلام اب بھی دنیا میں باقی ہے جس کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

دل میں شاعر کے نہیں خوفِ خدا، صدق و صفا
کیوں وہ رنگین نہ کرے کذب و ریا کا دفتر
"کفر[1] شاعر میں تو، اشعار میں اسکے ایماں"
یہ تھا ارشادِ نبی شعرِ امیہؔ سنکر
حُسنِ[2] کردار سے محروم ہیں اکثر شعراء
یہ دکھاتے ہیں فقط تیغِ زباں کے جوہر

---

[1] آمَنَ شِعْرُهٗ وَكَفَرَ قَلْبُهٗ ۔ امیہؔ کے دل میں کفر ہے اور اُس کے شعر میں ایمان ہے۔

[2] وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ۝ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ۝ وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ۝

سورۃ الشعراء آیت ۲۲۴ تا ۲۲۶

ترجمہ:- اور گمراہ لوگ شاعروں کی پیروی کیا کرتے ہیں کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور کہتے ہیں وہ جو کرتے نہیں۔

شعر یہ سُن کے سخنور رہوں غضبناک اگر
آیۂ سورۂ "شعرا"[1] پہ رہے ان کی نظر
شعر آہنگ ہے شاعر کے ربابِ دل کی
نغمہ بنتی ہے سخنسنج کی ہر آہِ جگر

---

[1] شاعر کو ہر لفظ کے صحیح تلفظ کا خیال رکھنا چاہیئے۔ وہ کرَم کو کرْم اور گرْم کو گرَم نہ لکھے۔ یہ مضحکہ خیز بات ہوگی۔ لیکن بعض سہ حرفی الفاظ کے غلط تلفظات رائج ہو چکے ہیں، جن کو تعلیم یافتہ لوگ مکروہ نہیں سمجھتے۔ بعض اساتذہ نے ان غلط تلفظات کو منظوم کیا ہے۔ "صاحَب"، "باقَر"، کافَر کے صحیح تلفظات صاحِب، باقِر، کافِر ہیں، لیکن یہ غلط تلفظات منظوم ہو چکے ہیں۔ مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم کا مصرع ہے "حمَل ساقط ہوا زیب النسا کا"، اس پر چکبست نے چوٹ کی تھی کہ حمْل میں م ساکن ہے۔ شرر مرحوم نے جواب دیا حمَل تلفظ اردو میں رائج ہے حمْل کہنا مضحکہ خیز ہوگا۔ مولانا حالی کا مصرع ہے "کہ ہوتی ہو حرکت سے برکت زیادہ" دراں حالیکہ حرکت اور برکت دونوں میں ر ساکن نہیں ہے۔ اساتذہ تسکینِ اوسط کی اجازت دیتے ہیں جب کسی رکن میں تین حروف متحرک ہوں۔ لیکن عربی الفاظ جیسے شعرأ، عُلَما، اثرات اگر مصرع کے وسط میں آجائیں، تو حرف دوم کو ساکن بنانا میرے نزدیک معیوب نہیں ہے۔ ان الفاظ میں حرف دوم کی صحیح (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فرطِ اندوہ سے ہوتے ہیں رواں جب آنسو
شعرِ تر ڈھل کے خود آتا ہے لبِ شاعر پر
خُفتہ جذبات کو کرتا ہے اچانک بیدار
شاعرِ سحر[1] بیاں شعر کا منتر پڑھ کر
سامری فن ہے وہی شاعرِ باطل آموز
جس کے گوسالہ صفت کِلک میں جادو کا اثر
شعر کے زورِ بیاں سے ہو کوئی رمز عیاں
حکم[2] و ارشاد میں شاعر کے ہو حکمت[3] مضمر

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) آواز گفتگو میں مشکل سے سُنائی دیتی ہے دیکھئے صفحہ شعر نمبر اور صفحہ کا پہلا شعر

[1] اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا — ترجمہ:- بے شک بعض بیان سحر ہوتا ہے۔ حدیث

[2] اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حُکْمًا — ترجمہ:- بیشک بعض شعر حکم ہوتا ہے۔ حدیث۔

[3] اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِکْمَةً — ترجمہ:- بے شک بعض شعر حکمت ہوتا ہے۔ حدیث

شعر[1] غارت گرِ باطل بھی ہے از قسمِ جہاد
ہے مجاہد کا عمل تیغ و زباں سے اکثر
ہجو[2] کرتے رہے حسانؓ بفرمانِ نبیؐ
رگِ باطل کیلئے ان کی زباں تھی نشتر

---

[1] قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَاذَا تَرٰى فِي الشِّعْرِ - فَقَالَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ يُجَاهِدُ بِسَيْفِهٖ وَلِسَانِهٖ - ترجمہ:- (رسول اللہ سے) پوچھا گیا کہ شعر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ آپ نے جواب دیا۔ بیشک مومن اپنی تلوار سے اور اپنی زبان سے جہاد کرتا ہے۔ حدیث

[2] قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ قُرَيْظَةَ لِحَسَّانَ بْنِ ثَابِتٍ اُهْجُ الْمُشْرِكِيْنَ فَاِنَّ جِبْرِيْلَ مَعَكَ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لِحَسَّانَ اَجِبْ عَنِّيْ اَللّٰهُمَّ اَيِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ

ترجمہ:- نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریظہ کے دن حسانؓ بن ثابت کو حکم دیا کہ مشرکین کی ہجو کرو بیشک جبریل تمہارے ساتھ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسانؓ سے فرمایا کرتے تھے کہ (دشمنوں کو) میری طرف سے جواب دو (اور آپ دعا کیا کرتے) کہ اے اللہ حسانؓ کی تائید کر اور قوت دے اس کو جبریل کے توسط سے۔ (حدیث)

ہجو[1] کہہ کے شفایاب ہوئے خود حسانؓ
ہجو سن سن کے شفا پاتے تھے ایماں پرور
عیب بینی بھی بری عیب تراشی بھی بری
اِثم و عدواں کی سزا، ہجو و مذمت ہے مگر
حکمت[2] و دلکشی پند سے ہو دعوتِ حق
ہے یہ فرمانِ خداوندِ اجلّ و اکبر
حکمتِ[3] دیں ہے جدا، حکمتِ دنیا ہے جدا
کاش سمجھے تو انہیں "سورۂ لقمان" پڑھ کر

---

[1] سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ هَجَاهُمْ حَسَّانُ فَشَفٰى وَاشْتَفٰى - رَوَاهُ مُسْلِمٌ - ترجمہ (حضرت عائشہ فرماتی ہیں) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حسانؓ نے کفار کی ہجو کی۔ پس اس نے مسلمانوں کو شفا دی اور خود بھی شفا پائی۔ رواہ مسلم۔

[2] اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ترجمہ۔ خدا کے راستے پر چلنے کی دعوت حکمت و موعظہ حسنہ سے دیا کرو۔

[3] وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حکمت و حکم کا سرچشمہ ہے قرآن حکیم[لہ]
ہے یہ ملک اُنکی جو ہیں پاک دروں پاک نظر
نفس کو جس سے ضرر، علم[ٹہ] وہ ہے جہلِ مبین
یہ کھلی بات سمجھ لے خردِ خامِ بشر
صدق ہے شعر کی جاں کذب و غلو موت اسکی
ٹوٹتی ہے دمِ اسقاط ہی بیکس کی کمر

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ الْحَمِيْدُ ۝ ترجمہ ۔ اور بیشک ہم نے لقمان کو دانائی عطا کی کہ (اے لقمان) خدا کا شکر گزار بن کر رہ ۔ اور جو شخص (خدا کا) شکر ادا کرتا ہے وہ بھی اپنے ہی فائدے کے لیے شکر کرتا ہے ۔ اگر کوئی ناشکری کرے تو پھر خدا بھی بے نیاز اور سزاوار حمد وثنا ہے ۔ سورۂ لقمان ۔ آیت ۱۲ ۔

لہ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ ترجمہ ۔ کہ یہ بڑے رتبے والا قرآن ہے جو کتاب مکنون میں رکھا ہوا ہے ۔ اس کو پاک لوگ ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں ۔ سورۃ الواقعہ ۔ آیت ۷۷ تا ۷۹

ٹہ اِنَّ مِنَ الْعِلْمِ جَهْلًا ۔
ترجمہ ۔ بعض علم جہل ہوتا ہے ۔ حدیث

اے سخن سنج و سخن چین و سخن سازِ عرب!
گونہ گونہ ترے خامے نے دکھائے جوہر!
یاس کا بل سے مرے دلکو جو ہوتا ہے سکوں
یاد آتا ہے مجھے قول یہ تیرا اکثر
"دہرِ بدخو نے[لہ] چلائے مرے خستہ دل پر
اس قدر تیر کہ وہ خود ہی بنے اس کی سپر!
شوق سے اور چلائے، مجھے پروا کیا ہے!
جنگ تیروں میں ہے، دل پر نہیں کچھ ان کا اثر"

یہ محاسن ترے اور یہ تھے معائب تیرے
مدعی اپنی نبوت کا ہوا تو کیوں کر

لہ یہ متنبی کے اشعار ہیں جن کا ترجمہ اوپر کے دو شعروں میں ہے ۔

رَمَانِي الدَّهْرُ بِالْأَرْزَاءِ حَتّٰى
فُؤَادِيْ فِيْ غِشَاءٍ مِّنْ نِبَالِ
فَصِرْتُ إِذَا أَصَابَتْنِي سِهَامٌ
تَكَسَّرَتِ النِّصَالُ عَلَى النِّصَالِ

ہوئی ہے مسحور ساری محفل، خموش ہے اب خطیبِ فاضل
حرم سرا گونجتی ہے لیکن، "صد آفریں" کی سرو صدا سے[1]
مگر ہے بیتاب ایک سامع، نہیں ہے جو آشتی کا طامع
بگڑ کے ہوتا ہے یوں مخاطب، وہ اپنے فاضل سخنسرا سے
"گزار یے معصیت میں راتیں، سُنائیے معرفت کی باتیں!
ریا سے جس کو ہوئی ہے الفت، اسے محبت نہیں خدا سے!
خطاب "سوزِ دروں" پہ سُنکر، یہ عینِ محفل میں کہہ چکا ہوں[2]
نشانِ منزل کبھی نہ پایا، کسی نے گمراہ رہنما سے
وہ جس میں ذوقِ سیاہ مستی، کہے نہ وعظِ خدا پرستی
نوائے صدق و صفائے واعظ، نہ ہو گی توام کبھی ریا سے"
خطیب کے لب پہ ہے تبسّم، اور اس کی آواز میں ترنّم
جواب دیتا ہے "پیارے ہمدم، دعا مرے حق میں کر خدا سے!

[1] "سرو صدا" یعنی شور و غل
[2] باب اول میں دیکھئے یہ مصرع:-
"غریب واعظ کے پاک دل میں زباں کا نشتر چبھو رہا تھا"

کہ ہو عطا مجھ کو زہد و تقویٰ، خطا سے ہو پاک میرا فتویٰ
صفائے دل اصفیا سے لیکر، بِلوں میں یکراست[1] اولیا سے!
یہ سچ ہے! مُبتلا ہوں معصیت کا، مگر ہوں سرچشمہ معرفت کا
ابوہریرہؓ[2] نے ورد سیکھا، بہ صد خوشی دشمنِ خدا سے
ادب کو تو سیکھ بے ادب سے، درستکاری کو بوالعجب سے
تحمّل و صبر کو غضب سے، خبر کو پہچان مبتدا سے!
ریا کا پہنا ہو میں نے جامہ، مگر مجاہد ہے میرا خامہ
سُن ایک شاعر کو اس کا نامہ، جہاد کرتا ہے یہ ریا سے!

واعِظ کا مکتوبِ منظوم فریدؔ کے نام

اے سیہ مست فریدؔ! اے سخن آرا! بس کر
بے بصر ہم نہیں، تجھ میں ہے اگر فکر و نظر!

[1] یکراست، یعنی سیدھا۔ [2] واعظ کا اشارہ بخاری کی اس طویل مگر دلچسپ حدیث کی طرف ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے آیت الکرسی کی فضیلت ابلیس لعین سے کس طرح سیکھی تھی۔

آہ! دیکھا جو تری مشقِ سخن کا منظر!
بس! وہیں بیٹھ گئے تھام کے ہم اپنا جگر!
سامنے جام و سبو، تکیۂ دیبا پیچھے!
اک طرف حقّہ، تو آغوش میں اک رشکِ قمر!
کبھی حُقّے کا لیا کش، کبھی شاہد پہ نظر!
دل میں شہرت کی ہوس ہے، نہ کہ اللہ کا ڈر!
ایک موضوعِ تخیّل کا بنا ہے محور!
مرتعش کف میں قلم، گاہ اِدھر، گاہ اُدھر!
کبھی افلاسِ تخیّل سے جبیں پر ہے شکن!
اور کبھی خستگیٔ فکر سے، بالین پہ سَر!
کبھی لفظوں کی حلاوت سے زباں پر ہے شکر!
اور کبھی لُطفِ تصوّر سے، تبسّم لب پر!
کبھی افکار کی یلغار سے محصور دماغ!
اور قلم سے کبھی قرطاس پہ برپا محشر!

تیز تر ہو دمِ خنجر سے اگر تیرا قلم
خُم پہ خُم، مے کے تو پیتا ہے، یکے بعدِ دگر!
اب کسی پند کو کرتا ہے تو اشعار میں بند
صید افگن ہے نہنگ، اشک سے چشم اس کی ہے تر!

آہ اے ملّتِ بیضا کے سیہ مست پسر!
نخلِ اسلام ہوا خشک نہ برگ اس میں نہ بر
جس کو اشکوں سے رسولؐ عربی نے سینچا
آبیاری سے ہے محروم، شجر وہ یکسر
تجھ میں عرفاں ہے، نہ احساں ہے، نہ ایمان عمل
اسوۂ پاکِ محمدؐ پہ نہیں تیری نظر!
مست بے جام و سبو رہتے تھے تیرے آبا
نانِ جَو اُن کی غذا تھی، تو چٹائی بستر
ایک تو ہے کہ گُل و مُل ہے ترا ذوقِ حیات!
اہرمن کے ہے تصرف میں ترا قلب و جگر!

دُخترِ رز ترا سرمایۂ نیروئے عمل
اُسکے ہی دم سے جہاں میں ہے ترا کسبِ ہُنر
منطق و فلسفہ تو نے تو پڑھا اے شاعر!
پر نہ ڈالی کبھی اک آیۂ قرآں پہ نظر
زہد و تقویٰ ہو کہاں! ہو نہ اگر پیشِ نظر
عظمت و ہیبت و جبروتِ خدائے اکبرُ
عظمت و سطوتِ اسلام ہوئی ہے پامال
اس تباہی کا سبب کون؟ ترا نفسِ اشرَّ!
داغ ہے دامنِ مِلّت پہ ترا فسق و فجور!
ترے کرتوت سے مُنھ اپنا چھپاؤں میں کدھر؟
ہائے! بے خواب ہوں، بے آب ہوں، بیتاب ہوں میں!
کاش! ہو تجھ پہ اس آشفتہ بیانی کا اثر!
گرچہ ہو خارجِ پوشاکِ ریا، ابلہ فریب
دیکھ لیتے ہیں مگر اس کا دروں اہلِ نظر

ہم نے مانا کہ ہے تو شاعرِ اعجاز رقم
ترے خامے سے ٹپکتے ہیں معانی کے گہر
سُکر میں فکر نہیں معتبر اے شاعرِ مست!
نہیں تقویٰ کے لئے سجدے میں مخمور کا سَر"
دیکھ نقاشِ سیہ مست کا نقشِ طاؤس!
اس میں ہُدہُد کا جو سر ہے، تو ابابیل کا پَر
ہے تمنا کہ بیاں میں ہو، رسالت کی ادا؟
دور کر لب سے، پٹک فرش پر اپنا ساغر!
طبع روشن ہو تری، نورِ الٰہی سے اگر
طائرِ فکر کو تیرے بھی ہو جبریل کا پَر
عجیب ہے قوّتِ بیانی، قوائے انساں کی ہے رانی
قلوب پر اسکی حکمرانی، کچھ اسکے اثرات جاودانی

باب (۱۸)

محفل برخاست ہوئی ہے۔ واعظ کے رفقاء رخصت ہو چکے ہیں۔ وہ اور محبوب تخلیہ میں ہیں، زید بھی باغبان کے جھونپڑے سے نکلنے کو ہے، کہ ناگہاں واعظ اور اس کے محبوب کے مابین ایک خوفناک جنگ چھڑتی ہے۔

ہوئی ہے یاروں سے بزم خالی، خطیب و شاہد ہیں تخلیہ میں
یہی مناسب ہے، میں بھی اُٹھوں، ہوا ہوں بیمار اس فضا سے
مگر یہ ہنگامہ کیا بپا ہے، نفاق دونوں میں پڑ گیا ہے
یہ عیش گھر گونجنے لگا ہے، اچانک اک جنگ فتنہ زا سے!
عجب عجب دلخراش طعنے، یہ ترکِ طناز دے رہا ہے!
نہ جانے کیوں ہو گیا ہے برہم، یہ اپنے دیرینہ آشنا سے؟

محبوب کے طعنے

"ہوا زمانہ ملی نہ پائی، ہے مفت میں ہم سے آشنائی
کہاں ہے وعظوں کی وہ کمائی کہ جس کا وعدہ تھا ابتدا سے؟
کما کے لائیں نہ عشق والے، تو کھائیں کیا خاک حسن والے!
کہ زندہ انسان ہے غذا سے، نہیں وہ جیتا فقط ہوا سے
نہ کوئی گھر در، نہ زر نہ زیور، نہ گرم روٹی، نہ نرم بستر
بلا یہ انعام اس حسیں کو، جو عشق کرتا رہا گدا سے
ہمیشہ قلاش اگر ہو عالم، تو کیا رہے عقل اس کی سالم!
عمامہ نانِ جویں پہ بیچے، جو تنگ ہو بھوک کی جفا سے
نہ کر سکیں آپ اگر کمائی، تو ختم ہے ہم سے آشنائی!
عذاب ہے تنگدست عاشق، بچائے اللہ ہر بلا سے!
کما کے عاشق اگر نہ لائے، فقط محبت کے گیت گائے
تو یار کیوں اس کو منہ لگائے، رہے وہ دُور ایسے بے حیا سے!

پیا وہ پیارا ہے جو کمائے، اور اپنے محبوب کو کھلائے

اسی کو کوئی گلے لگائے، ہو باغ باغ اس کی ہر ادا سے

نہیں ہے سودائے عشق مجھ کو، بجا ہے یہ آپ کی شکایت!

مجھے ہے الفت سے ایسی نفرت، کہ جیسی بیمار کو دوا سے!

عبث ہی غوغائے عشق و الفت، ہے اسکی علت سمجھ کی قلت

نتیجہ اس کا ملال و ذلت، نہ کوئی مانے، مری بلا سے!

جو عشق کا لازمی ہے سودا، تو کوئی ہو آپ اپنا شیدا!

یہ کیا جنوں ہے کہ مضطرب ہو، وہ غیر کے عشوہ و ادا سے!

سُنا ہے فرہاد کا فسانہ، جنون و وحشت کا شاخسانہ!

ہوا نہ کچھ فوت وہ قضا سے، فنا ہوا، اپنی ہی خطا سے!

جمال اگر ہے بحال میرا، رہے گا جاہ و جلال میرا!

مجھے غرض کیا کہ دل لگاؤں، میں ایک درویش یا گدا سے؟

نہ چین دے گا خیال میرا، اُسے جو دیکھے جمال میرا!

وہ اپنی آنکھوں کا سرمہ جبتک، بنا نہ لے میری خاک پا سے!

اگر نہیں پاس آپ کے زر، تو ڈھونڈھیئے کوئی اور دلبر!

کہ شاہ دل شاہ سے لگائے، گدا محبت کرے گدا سے!"

غرور و پندار و خود ستائی، ہے نفسِ سرکش کی کج ادائی

یہ جرمِ اوّل تھا جس کے باعث غضب میں آئی تھی کبریائی

واعظ کا "سوزِ دروں" "سوزِ بروں" میں مبدّل ہوتا ہے۔ وہ غضبناک ہو کر جواب دیتا ہے:-

یہ سُن کے واعظ نے ہچکیاں لیں، بھریں کئی شعلہ بار آہیں

کہا کہ "اے مخزنِ خباثت! خدا بچائے تری ہوا سے!

جو میرا مشرق، وہ تیرا مغرب، شمال میرا، جنوب تیرا!

نباہ کیونکر کرے محقق، تری طرح پیکرِ خطا سے؟

اگر تو کذب و ریا کی مورت، تو میں ہوں صدق و صفا کی صورت

جو ہوتی ضدین میں محبت، نہ بھاگتی تیرگی ضیا سے!

نہیں مجھے اس کا غم ذرا بھی، کہ تو نے لوٹا مجھے دغا سے

کماؤں گا سیم و زر دوبارہ، میں وعظ دیدے کے اغنیا سے

یہ بات قسمت کی تھی کہ تجھ پر، لٹاؤں وعظوں کی سب کمائی
ہوں راضی اللہ کی رضا سے، میں جنگ کرتا نہیں قضا سے!

لٹی ہے ثروت اگر تو کیا غم؟ یہی ہے لیکن ملال ہر دم
کہ تو نے ڈورے جو مجھ پہ ڈالے، تو رشتہ ٹوٹا مرا خدا سے!

گیا وہ سوز و گداز میرا، گئیں وہ آتش نوائیاں بھی
خلوص دل سے ہوا جو رخصت، اثر بھی غائب ہوا صدا سے!

غضب ہے اے محورِ شرارت! کہ تو نے مجھ ایسے پارسا کو
نکال کر بزمِ اولیا سے، ملا دیا حزبِ اشقیا سے!

خدا کی پھٹکار اس حسیں پر، غضب ہو اُس شوخ نازنیں پر!
کرے جو اک متقی کو گمراہ، عشوہ و غمزہ و ادا سے!

مگر یہ ہے داستانِ ماضی، ہوں اپنے بختِ سیہ سے راضی
بلائیں ہوتی ہیں سر پہ نازل، ہمیشہ اللہ کی رضا سے

جو بات تقدیر کی لکھی ہے، کبھی نہ تدبیر سے مٹے گی
مرض اگر موت بن کے آئے، مریض کیونکر بچے دوا سے؟

چراغِ ایماں ہوا جو روشن، تو میں نے ظلمت میں راہ پائی
ملی وہ لیلائے معرفت بھی، جو تھی گریزاں مری ہوا سے

سن اے جفا کارِ حسن والے! سن ایک عاشق کے گرم نالے!
نہیں تعجب کہ تیری نخوت، ہو خاک اس آتشیں صدا سے

فضائے تقویٰ کو جو بگاڑے، وہ گندگی ہے ترے عمل میں
نگاہِ عارف میں تیرا رتبہ، بڑا ہے طاعون کی وبا سے!

کبھی میں اک مردِ پارسا تھا، عمل میرا وعظ و اہتدا تھا
نہ تھی جہاں میں کسی کی پروا، غنی تھا میں دولتِ غنا سے

نہ جانتا تھا شراب کیا ہے، نوائے چنگ و رباب کیا ہے
یہ عشقِ خانہ خراب کیا ہے، سمجھ میں آیا تری جفا سے

یہ سچ ہے تھی زر سے مجھ کو الفت، وگرنہ تھی پاک میری طینت
عداوت و کینہ و جفا سے، خباثت و فتنہ و دغا سے

خدا ہی شاہد ہے آنکھ بھر کر، کبھی نہ دیکھا کسی حسیں کو
ہمیشہ تھا پاک میرا دامن، میں دور کوسوں رہا زنا سے

ہوا ہو سودائے حور جس کو، نہ بھائے فسق و فجور اُس کو

میں غور کرتا مراقبوں میں، کہ عیش اُڑاؤں گا کب فنا سے

نماز روزہ جو شوق میرا، تو فقر فاقہ تھا ذوق میرا

فلک پہ شعرا تھا دنگ میرے، مقام کی رفعت و علا سے

فریب اگر حال و قال تیرا، تو شر سراپا خیال تیرا!

ہے بے وفا بال بال تیرا، خدا بچائے تری جفا سے!

فساد و فتنہ جمال تیرا، فریب سازی کمال تیرا!

غضب خدا کا وصال تیرا، بچوں گا کس طرح میں سزا سے؟

عبث ہے مال و منال تیرا، فضول جاہ و جلال تیرا!

قریب ہے اب زوال تیرا، مٹاؤں گا تجھ کو بد دُعا سے!

بس اب تو ہوں ملتجی خدا سے، کہ درگزر کر مری خطا سے

طفیل سے مصطفےٰؐ کے یارب! نجات دے مجھ کو اِس بلا سے

نعوذ باللہ نعوذ باللہ! بس اب رہے وردِ ربنا اللہ!

ملائکہ مجھ پہ ہونگے نازل، نجات پاؤں گا ما سوا سے!

چکھی ہے ایمان کی حلاوت، مرے لئے سہل ہے قناعت

خدا کرے تیرا حُسن غارت، کہ تجھ کو ٹھکراؤں پشتِ پا سے!

قناعت اصلِ تونگری ہے، اسی سے شانِ قلندری ہے

فقیر کی یہ سکندری ہے، ملی ہے جو ربِّ ذو العُلا سے!

یہ پاسخِ سینہ ریش سُن کر، ہوا ہے غمناک ماہ پیکر

وہ، ہائے! آنسو بہا رہا ہے، چھُپا کے مُنہ کاکلِ رسا سے!

ہٹا نہ جو زورِ سیم و زر سے، دبا نہ جو خنجر و تبر سے

وہ صاحبِ عزم اے فسونگر! تڑپ اُٹھا تیری چشمِ تر سے!

باب (۱۹)

بنا ہو دل رشکِ سنگِ مرمر، تو کیا اثر چشمِ تر کا اُس پر؟
کبھی پسیجا نہ کوئی پتھّر، کسی بھی محزون کی بکا سے!

مذاقِ ایثار و غمگساری! نہیں کوئی امر اختیاری
انہیں کی اکثر ہے یہ سعادت، جو خستہ ہیں دہر کی جفا سے!

کنارہ کش ہو گیا ہے واعظ، بُتوں کے عشقِ شکستہ پا سے!
ہزار روتے صنم بلا سے! بلا ہے اب اُس کا دل خدا سے!

وہ ہو کے "سوزِ دروں" سے مضطر، گیا ہے حوضِ چمن پہ اُٹھ کر
قرار غسل و وضو سے پاکر، ہوا ہے گرمِ سخن خُدا سے

قرار میرے لئے ہے مشکل، خطیب ہے راستے میں حائل
کہیں نہ غمّاز ہو، یہ ڈر ہے، مجھے خود اپنی صدائے پا سے

جگر سے اُٹھتی ہیں اُس کی آہیں، بڑی ہی پُرسوز ہیں نوائیں!
ہوا ہے میرا بھی دل مسلماں، خطیبِ مخلص کی اِس دُعا سے

دُعا سے صبر و سکوں ہے پیدا، فسردہ ہو دل کہ چشم پرنم!
نہ بِل سکا کافرِ حزیں کو، کبھی یہ زخمِ جگر کا مرہم!

شکستہ دِل واعظ کی دُعا

اےؔ کہ تیرا لطف ہے، وجہِ نمودِ کائنات!
اے کہ ہر شے کی رگ و پے میں ہے مخفی تیری ذات!

اے کہ ہیں دن رات گردش میں ترے شمس و قمر!
تا کہ ہو بزمِ جہاں میں رات سے دن، دن سے رات!

اے کہ ہر ذرہ ترے ابرِ کرم سے فیضیاب!
اے کہ ہر قطرہ پہ ہے تیری نگاہِ التفات!

اے کہ گرداں تیری چٹکی میں فلک ہیں سات سات!
اے کہ تیرے علم میں کون و مکاں کی بات بات!

آہ! اے ربِّ اُمم! اے مبدءِ لطف و کرم!
میری جانِ خستہ پر، ہوتے ہیں کیا کیا حادثات!

ؔ یہ مصرع مولانا ظفر علی خاں کا ہے

میرے حق میں ہے خزاں اس باغِ عالم کی بہار!
ہر گلِ رنگیں یہاں کا ہے مری نظروں میں خار!
ولولے سب مٹ چکے، اک یاس ہے ہمدم مری
جس نے باندھے دشتِ دل میں آرزوؤں کے مزار!
میرے ارمانوں کے خرمن پر گری ہیں بجلیاں!
کس طرح روکوں میں اپنے دل کی آہِ شعلہ بار؟
شمع کی تابِ شکیبائی سے مَیں محروم ہوں!
کیسے مُشتِ خاک میں ہو اس کی آتش کا وقار؟
عشقِ غارت گر کے ہاتھوں، دیکھ میرا حالِ زار!
پارہ پارہ ہے گریباں، اور دامن تار تار!
دہر نے مجھ پر چلائے تیر اپنے، پے بہ پے
نے دمِ عیسیٰ، نہ مرہم، کیوں نہ روؤں زار زار؟
آہ! میں کب تک سہوں، جور و جفائے روزگار!
کتنے اب باقی ہیں میری عمر کے لیل و نہار؟

سُن نہ سُن میری دُعا، یارب! تجھے ہے اختیار!
مجھ کو یہ حق ہے کہ میں تجھ کو پکاروں بار بار!
آگ کے شعلے اُٹھیں، دریا سے تو چاہے اگر
اور نکلیں کلّۂ آتش فشاں سے آبشار!
یاالٰہی! نور دے! ظلمت میں گُم سُم ہو کے میں
کب تلک دیکھا کروں نفس و خرد کے معجزات؟

کرتی رہتی ہے صبا اٹکھیلیاں وقتِ سحر
اسکی موجوں میں ہے، یارب! تیری حکمت جلوہ گر!
آتش و چقماق و آہن سے جو اڑتے ہیں شرر
ان کی تصویریں بھی ہیں محفوظ لوحِ پاک پر!
ہر حبابِ بحر و جُو اُٹھتا ہے، تیرے حکم سے
اور فنا ہوتا ہے موجوں میں تو تجھ سے پوچھ کر!
آہ! اس قطرے کی ہر کروٹ پہ ہے تیری نظر
جو ہزاروں مرحلے طے کر کے بنتا ہے گہر!

یہ اگر ہے تیری قدرت ہے یہ آگاہی تری
کیسے پھر مانوں کہ تو ہے میرے غم سے بے خبر!
دیدۂ بینا سے پوشیدہ نہیں تیری صفات
آئنہ ہے تیری عظمت کا نظامِ کائنات!

دل مرا بے تاب ہے، سجدہ میں ہے میری جبیں!
قول ہے تیرا کہ مضطر کی دُعا ٹلتی نہیں
میں سراپا معصیت، اور عفو بے پایاں ترا!
تو نہ بخشے گا تو کیا دُنیا مری، کیا میرا دیں!
دور کر "سوزِ دروں" اور دل کو دے صبر و سکوں!
میرے حق میں اس سے بہتر دوسری نعمت نہیں
دونوں[له] عالم میں ہمیں حسنات سے ممنون کر!
رکھ عذابِ نار سے محفوظ، ربُّ العالمیں!

له رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

جفا کا طوفان یہ جو اٹھا، تو بجھ گئی شمعِ عشق میری!
اسی طرح جیسے دم کے دم میں، چراغ ہوتا ہے گُل ہوا سے!
ظَلَمْتُ نَفْسِي، ظَلَمْتُ نَفْسِي! ہزار لعنت بہ کارِ شیطاں!
یہ کہہ کے واعظ بلا تأمّل، وداع ہوتا ہے اِس بلا سے!
وہ صاف دل، پاک رائے مالی، چمن کے در تک تھا ساتھ میرے
اسی طرح بے خودی میں رخصت، ہوا میں اس مردِ باخدا سے
میں قلبِ مضطر کو لے کے لوٹا، دُعا یہ کرتا ہوا خدا سے
کہ اے مرے کارساز مولیٰ! بچا حسینانِ بے وفا سے!

باب (٢٠)

اس واقعہ کے بعد زید کے افکار

بشر نے جو زندگی بسر کی، نہ تو نے اس پر کبھی نظر کی
رہا وہ صحرائے جستجو میں، خبر نہ لی اس نے اپنے گھر کی
نہ پا سکے گا وہ چین جب تک، نہ ہوگی تہذیبِ نفس کامل
رہے گی اقلیم دل میں جاری، یہ جنگ جذباتِ خیر و شر کی
کبھی اَرِنی کا ہے تقاضا، کبھی انا الحق کا ہے تماشا
فرشتے حیرت سے لکھ رہے ہیں، کہانی اس کے دل و جگر کی!
میانِ امید و بیم و زاری، ہے سعی تارِ نفس پہ جاں کی
عجب کشاکش میں روح پیاری، رہی ہے انسانِ بے خبر کی

یہ سچ ہے دن رات رو رہا ہوں، مگر تجھے کب تلک رلاؤں؟
اسی لئے ذکرِ عاشقی میں، جو میں نے کی بات مختصر کی!
جو دم لیا میں نے گھر میں آکر، تو تھی زباں پر دعائے واعظ
حضور میں ربِّ دو جہاں کے، نہ میں نے رونے میں کچھ کسر کی
بگڑ چکے ہیں جو کام لاکھوں، سنورتے ہیں پھر دعا کے دم سے
قرار پاتے ہیں رفتہ رفتہ، جو دل ہیں بیتاب سوزِ غم سے!

باب (۲۱)
ہاتف کی ندا

دعا تھی جاری کہ گوشِ دل میں، صدا یہ آئی کہ "آہ! غافل!
خطیبِ فاضل کی طرح تو بھی، ہوا تھا ابلیس کا نشانہ
جو گوش ہو حق نیوش تیرا، تو میں بتاؤں وہ "خُلق" کیا ہے
طفیل سے جس کے تجھ کو حاصل، ہو عشرت و عیشِ جاودانہ
نجات پا ہر خیالِ بد سے! خباثت و کینہ و حسد سے
وفورِ عفو و سخا ہو دل میں، سلوک ہر جاں سے منعمانہ
ہو فکر و نطق و عمل میں عِفّت، تو اثم و عدوان سے برائت
توکّل و صبر و عزم و جرأت، کے ساتھ کردار مسلمانہ!

بنائے ایماں پہ ایستادہ، ہے نفس کے ارتقا کا زینہ
بلند زینے پہ ہو کے چومے، وہ قصرِ باری کا آستانہ!
زباں پہ ہو حمد و ذکرِ باری، کہ وجد و رقّت ہو خود ہی طاری!
نگاہ میں کعبۂ محمدؐ، وہ طائرِ دل کا آشیانہ!
خود آشنائی میں سعیِ پیہم، خطائے فکر و عمل کا ماتم
تہجّد و ذکرِ نیم شب کا، ہے نفسِ سرکش کو تازیانہ!
ہے نورِ مردِ خدا کی صحبت، نہ ہو وہ حاصل تو شمعِ خلوت!
درونِ دل شاہدِ حقیقی، نَفَس نَفَس عشق کا ترانہ!
ہو ترکِ سُستی، عمل میں چُستی، مئے توکّل سے سر میں مستی!
ضعیف و مظلوم کی حمایت، خلاف ہر چند ہو زمانہ!
جو آئے ابلیس بزمِ دل میں، کہ ہے وہ موجود آب و گل میں
تو دفعۃً خنجرِ تعوّذ کی کھائے، ایک ضربِ قاتلانہ!
نگاہ میں اُسوۂ محمدؐ، تو دل میں "خُلقِ عظیم"[1] اُن کا
یہ درس قرآں سے لے! کہ ہے وہ عمل اور ایمان کا ترانہ

---

[1] وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ○ سورہ القلم - آیت ۴

ہمیشہ ہو پاک جسم و جامہ! مگر نہ ہو فخر کا عمامہ!

ہے موجبِ لطفِ سوز و رقّت ریاضِ ذاتی کا آب و دانہ

ہے آب و خور میں بھی حزم لازم، کہ عدل ہو جسم و جاں میں قائم

حلال نعمت کا ترکِ دائم، ہے مسلکِ غیر مسلمانہ

یہ حکم ہے فاطرِ ازل کا، کہ سعی بخشندۂ جزا ہو

جو مرغ نکلے نہ آشیاں سے، وہ کس طرح پائے آب و دانہ؟

یہ گوشہ گیری تری جہاں سے، گریز کرنا ہے امتحاں سے

جزا کا حقدار ہو نہ کوئی، تو پھر کھُلے کیوں درِ خزانہ

ہے مردِ کامل کا شغلِ عشرت زمیں پہ ہنگامہ آفرینی

اُٹھے جو مشتِ غبار اس کا، تو خود بنے بیٹھے اک فسانہ

جہاں کو معروف کا سبق دے! بُروں کو منکر سے روکتا جا!

یہ کام کر ہو کوئی زمانہ! نہ مصلحت کا بتا بہانہ!

برائے اصلاحِ نفسِ انساں، زمیں پہ مسلم کی ہے خلافت

وہ اپنی اصلاح پہلے کر لے، کہ حکم اس کا ہو مصلحانہ!

ہے جستجو آبِ زندگی کی، تو پہلے عصفور پر نظر کر

وہ کس مشقت سے لحظہ لحظہ، تلاش کرتی ہے دانہ دانہ!

یہ "خُلق" تجھ میں اگر ہو پیدا، تو ہوں فرشتے بھی تجھ پہ شیدا!

جُھکائے گا جس طرف نظر تو، اُدھر ہی جُھک جائے گا زمانہ

یہی ہیں مردِ خدا کے جوہر، انہیں سے بنتا ہے وہ یگانہ

جو ہو میسّر یہ دل کی دولت، تو تیری عشرت ہے جاودانہ!"

تلقینِ رحمانی

حصّہ دوم

اِنتساب

مولانا عبدالمجید سالکؔ مرحوم

کے

نام

جن کی ترغیب سے یہ نظمیں لکھی گئیں

پیش لفظ

خطبۂ شیطانی اور تلقینِ رحمانی کا افسانہ لکھنے کے بعد شعر گوئی کی خواہش میرے دِل میں مطلق نہ رہی۔ اِس افسانہ کے بعد تقریباً پندرہ سال تک میں نے نہ کوئی نظم لکھی نہ شعر کہا۔ ۱۹۵۴ء میں سالکؔ مرحوم نے افسانہ کا تعارف لکھا جس میں تاکید فرمائی کہ میں شعر گوئی کا سلسلہ جاری رکھوں۔ پس یہ چند نظمیں "تعارف" کے بعد لکھی گئیں جو کارخانہ تجارت کتب کراچی کے ماہنامہ "تذکرہ"[1] میں شائع ہوئیں۔ میں نے نظموں کا یہ مجموعہ تبصرہ کے لئے کسی نقّاد کی خدمت میں نہیں بھیجا۔

میری کئی نظمیں جن کے عنوانات "اقبال"، "مزدور"، "شہادت" تھے۔ اس کتاب کی طباعت کے وقت نہ مِل سکیں۔

۱؎ کارخانہ تجارت کتب کراچی کا رسالہ "تذکرہ" کئی سال تک اِسلام کی خدمت کرتا رہا۔ دین، اخلاق اور تاریخ کے موضوعات پر پاکستان کے مشہور اہلِ قلم کے مضامین اس رسالہ میں چھپتے رہے۔

تلقین

کیا ہو اِس زیست میں انسان کا مقصود و مرام؟

جس کو یہ فکر نہیں اس کا بُرا ہے انجام

نفسِ سرکش نے بجھا دی ہو اگر شمعِ خرد

تا کہ ہم رنگ نظر آئیں حلال اور حرام،

لذّت و لطف سے ایمان کے محروم ہو طبع،

اور لُبھائے نہ اُسے خالقِ کونین کا نام،

قوّتِ کار ہو مفقود، ارادہ معدُوم

شرِّ شیطاں نے غرض، دل کا بگاڑا ہو نظام،

تو اِن آلام کا درماں ہے فسونِ تلقین!

یہ کھُلی بات ہے، اِس میں نہیں کوئی اِبہام،

تخمِ دیں بو کے نہ پھل پائے گی ہر گز تلقیں

گر نہ موزوں ہو زراعت کے لئے دِل کی زمیں!

کیا ہے اُس پند کی قیمت جو ہلاکت سے بچائے؟

غور کر، ناصحِ[1] دل سوز کا کیا ہے اِنعام!

کر چکا غور تو سُن پندِ دل آسائے فریدؔ

اہلِ دل کے لئے ہے آبِ حیات اُس کا پیام!

گو ہے وہ گلشنِ اسلام کا اِک سایہ نشیں

اُس[2] کو حاصل ہے مگر فکر کی دنیا میں مقام!

ظاہراً، فکر و عمل، نُطق و بیاں میں آزاد

باطناً، دین کے اِیما سے ہے مِلّت کا غلام!

سچ ہے اِظہارِ حقائق کا بُرا ہے انجام

ہے وہ سرشار مگر پی کے مئے عشق کا جام!

---

[1] غور کر کہ سعدیؔ، رومیؔ، علامہ اقبالؔ (رحمۃ اللہ علیہم) کے ہم پر کیا احسانات ہیں۔

[2] اس بند میں خود ستائی مقصود نہیں، صرف شاعرانہ شوخی ہے (فریدؔ)

کیوں نہ ہو اُس کی زباں بندِ ریا سے آزاد؟

توسنِ فکر کو اُس کے نہیں دہشت کی لگام!

بسکہ ہے جُرعہ کشِ بادۂ خُمخانۂ عشق

اُس کا موضوعِ سخن، عشرتِ انساں کا دوام!

مستی و بادہ کشی، مدحتِ حُسن و سَاقی

کچھ نہیں اِس کے سوا عشق کے گھر میں باقی!

اے مسلمان! ہے اعجاز یہ قرآن ترا

ہاتھ ہے خالقِ کونین کا ایمان ترا

کل تلک طوق و سلاسل ہی تھا سامان ترا

آج جاری ہوا اس ملک پہ فرمان ترا

دیکھ تو قوّتِ بے مِثل دلِ نیک نہاد!

مُرغ آزاد ہوا، دام میں آیا صیّاد!

فصلِ گُل ہے طرب انگیز تُو ہو نغمہ طراز

گلشنِ دہر میں پوشیدہ نہ رکھ عشق کا راز

جنسِ جاں تیری ہے بازارِ جہاں میں ارزاں

بسکہ ہے بعدِ فنا اُس کی بقا کا آغاز

دیکھ لے پھر یہ جہاں تیرا جنونِ جانباز

وہ تگ و تاز تری، جس کا فسانہ ہے دراز!

دیکھ لے پھر یہ زماں تو بھی ہے مردِ میداں

وہ تہوّر بھی ترا جس پہ ہے ایمان کو ناز!

زور و زر، عِلم و ہنر ہی پہ رہا کفر کو ناز

تیرے ایماں نے دکھایا مگر اپنا اِعجاز!

گو حوادث سے لرز جائیں زمیں اور زماں!

مردِ مومن کے لئے حِصنِ حصیں ہے ایماں!

دس ہوں اعداء، تو ہو تُو یکّہ و تنہا رن میں

شِرک سمجھا نہ کبھی جذبۂ توحید کا راز

گر نہ مجبور ہو پستی پہ نہ اُترے شہباز

اُس کو رِفعت ہی سے حاصِل ہے نشاطِ پرواز

لغزشِ پا سے تگ و دو میں جو گِر جائے سمند

مرتبہ خر کا اِس افتاد سے ہوگا نہ بلند!

جاں بکف ہو کے حمایت کو اٹھے، لا وہ جگر!

جب سُنے تو کِسی مظلوم کی دل ریش آواز

نہ دکھا شوخیٔ شیرین و فتورِ فرہاد!

نہ سُنا قصۂ بے معنیٔ محمود و ایاز!

کہہ چکا تُو کہ تھی لیلےٰ کی ادا عشق نواز!

سُن چکا میں کہ تھی مجنوں کی بُکا زہرہ گداز

لِکھ لیا یہ کہ تھی شیریں کی سُریلی آواز!

اور فرہاد کے رونے کا بُرا تھا انداز!

کیا تجھے اِس سے کہ بیٹھیں کہیں دیوانے دو!

اور سمجھیں کہ ہے اقرارِ جنوں راز و نیاز!

کیا حسینوں میں بجز ناز و ادا ہے باقی!

بادۂ معرفت ان کو بھی پلا اے ساقی!

تجھ میں طاقت ہے اگر، پھر درِ خیبر کو اُکھاڑ!

تجھ میں ہمّت ہے تو بَن خالدِ جانبازِ حجاز!

وہ جہاں تاز و جہانگیر و شجاع و فعّال

اور تُو بادہ کش و رقص کُن و نغمہ نواز!

پھر لگا نعرۂ تکبیر کہ تھرّائے زمیں!

اور چکرائے فلک سُن کے یہ جنگی آواز!

تو مسلمان ہے! پھر باندھ کے اُٹھ سر سے کفن!

کب تلک رقص و مئے و مطرب و محبوب و چمن!

قائدِ اعظم محمّد علی جناحؒ

(ماہِ دسمبر میں ان کی وفات کی مناسبت سے)

تیرے ہنگاموں سے، اے سندھ کے مردِ فعّال
آسماں مان گیا حضرتِ انساں کا کمال!

کیوں طربگاہِ جہاں میں ہو مسلماں کنگال؟
ربِّ کعبہ کی امانت کا وہی ہے حمّال!

پشت باں تیری تھی توفیقِ الٰہی ہر دم
سلطنت ہم کو ملی جس کا نہ تھا خواب و خیال!

آج مُسلم کی قلمرو میں ہے یہ ملکِ وسیع
سرحد و سندھ سے تا مرزِ بعیدِ بنگال!

اپنے آثار سے معروف ہیں ابطالِ جہاں
صفحۂ دہر پہ ہے تیرا نشاں پاکستاں!

آہ! تو پاک نظر، صاف دروں، صِدق نواز
نکتہ ور، تیز زباں، تُند قلم، نیک خصال!

تیرے چہرے پہ عیاں عزم و تہوّر کا جلال
دِل کی محمِل میں نہاں لیلیٔ الفت کا جمال!

تیری عظمت کا پتا دیتے تھے اگلے رمّال[1]
آج گاتے ہیں ترے گیت جہاں کے قوّال!

حکمراں کر دے غلاموں کو جو بے تیر و تفنگ
کہیں تاریخ کے دفتر میں نہیں اِس کی مثال!

رادمردا! پنے زمانے کا ترا نام جناح
چُومتے تیرے قدم فتح و ظفر فوز و فلاح!

---

[1] قائدِ اعظم کے لڑکپن ہی میں بہت سے منجّمین اور دست شناس نے پیش گوئی کی تھی کہ دنیا میں ان کے نام کا ڈنکا بجے گا۔

لطیفہ

اس نظم میں ایک لطیفہ پیش کیا گیا ہے جسے پڑھ کر قارئین محظوظ ہوں گے ، اور ان کی توجہ چند دلچسپ باتوں کی طرف منعطف ہوگی۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ نفس کشی اور ریاضت سے بنائی ہوئی روحانی عمارت ، اگر توحید ، ایمانِ کامل اور عقلِ سلیم کی بنیادوں پر استوار نہ ہو ، تو وہ کسی وقت بھی منہدم ہوسکتی ہے۔ نظم کا معترَف مرتاض ایک نعرہ سُن کر بیہوش ہوجاتا ہے۔ برعکس اس کے ریاضت کرنے والے مسلمان فقرا ، نہ جنوّں بھوتوں سے ڈرتے ہیں ، نہ شیروں اور اژدہوں سے۔ ایک ولی اللہ دنیا کا سب سے نڈر انسان ہوتا ہے۔

نظم کے آخری بند ہندی بولی میں لکھے گئے ہیں۔ اردو اور ہندی میں کیا فرق ہے ؟ دونوں زبانوں کی صرف ونحو ایک ہے۔ دونوں کے بنیادی مصادر (افعال) جیسے اُٹھنا ، بیٹھنا ، چلنا ، پھرنا ایک ہی ہیں۔ اردو میں جو عربی اور فارسی کے اسماء اور صفات مستعمل ہیں ، انھیں نکال کر ان کی جگہ سنسکرت الفاظ بھر دیئے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو تلفظات

کی لطافت ، لچک ، شیرینی اور موسیقی ہندی زبان سے غائب ہوچکی ہے۔ سنسکرت کے الفاظ اردو بحروں میں استعمال کرتا ہوں ، تو ساکن حروف کو متحرک اور متحرک حروف کو ساکن بنانا پڑتا ہے۔

سنسکرت الفاظ فارسی اور اُردو کی بحروں کے اوزان میں نہیں بیٹھ سکتے۔ سنسکرت میں ہزاروں الفاظ ایسے ہیں کہ ہر لفظ میں تین تین ، چار چار حروف باہم گُتھے ہوئے اور لپٹے ہوئے ہوتے ہیں ، جیسے "سَپشٹ" یعنی صاف ، واضح۔ اس کلمہ میں "س" مفتوح نہیں ہے۔ "س" کی ادھوری آواز "پ" کی آواز سے ملحق ہے۔ جیسے "کرِشن" = "کشن" جیسے "شاسُتر" = شاستر۔ بھگوت گیتا کے منظوم فارسی ترجمہ میں (جو فیضی کے نام سے منسوب ہے) مترجم کو انہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ اس ترجمہ میں متعدد سنسکرت الفاظ کے غلط تلفّظات مجبوراً منظوم کیئے گئے ہیں۔ ہماری بحروں کے سبب اور وتد کے قواعد کا اطلاق سنسکرت الفاظ پر نہیں ہوسکتا۔ ہندی دانوں کو جو سنسکرت الفاظ کے دلدادہ ہیں چاہیئے کہ نئی بحریں ایجاد کریں۔ البتہ ان کے لئے سنسکرت کی ساختہ و پرداختہ بحریں موجود ہیں۔ ہندی شاعری کا مستقبل تاریک معلوم ہوتا ہے۔

لے گیا حُسن کا جادو مجھے صحرا کی طرف
دامنِ دشت میں تھا میری بھی لیلیٰ کا مکاں

عشق کیا شے ہے بجز زورِ درونِ ارماں
نفسِ خودخواہ کی شوریدگی وآہ و فغاں!

حُسن کیا چیز ہے؟ اے نطق! تو اندھے کو بتا
کیسے فردوسِ نگہ شکل میں ہوتا ہے عیاں!

گر تو سمجھا نہ سکی ترشی و تلخی کیا ہے
حُسنِ لیلےٰ کی ملاحت کا نہ اب چھیڑ بیاں!

ذوق واحساس کی تعبیر[1] سے عاجز ہے زباں
اِن مطالب کے لئے تنگ ہے آغوشِ بیاں

لب پہ آہی نہ سکی، لذتِ دِل، دل میں رہی
سیرِ دریا کی ہوس دامنِ ساحل میں رہی!

تنِ تنہا تھا سفر، دل میں نہ تھا خوف وخطر
جنگ کرتا ہے جنوں جوش میں بے تیر وکماں!

[1] عبارت میں لانا

دوپہر کی تھی کڑی دھوپ، بھیانک صحرا
عشق کے سامنے کیا شے ہے زماں اور مکاں!

پیاس اور بھوک کی شدّت سے ہوا میں بیتاب
آب وخوراک کا صحرا میں نہ تھا نام ونشاں

تشنہ بے تاب ہے تیرے لئے، اے خنکیٔ آب
تیری فرحت پہ مئے ناب کی لذّت قرباں!

تھک کے میں بیٹھ گیا ایک شجر کے نیچے
سایہ ہوتا ہے بیاباں میں مسافر کا مکاں

خاکبازی کے سوا عشقِ مجازی کیا ہے؟
عقل پر نفس کی یہ دست درازی کیا ہے؟

ایک شُتر دُور سے آتا ہوا دیکھا میں نے
ناقۂ محملِ لیلےٰ کا ہوا اُس پہ گماں

حیطۂ دید میں آکر وہ نمایاں جو ہوا
دیکھ کر اُس کو لگا کانپنے رواں رواں

خطرِ جاں نے اُٹھایا مجھے بالائے شجر
کرلیا برگ کی دیوار کے پیچھے پنہاں

سامنے[1] میرے تھا اک مردِ عجیب الخلقت
چہرہ لنگور کا ، اور شیر کے مانند دہاں
قدّ و قامت میں وہ تھا اونٹ کے مانند بلند
گرگِ تشنہ کی طرح منہ سے لٹکتی تھی زباں
خاک آلودہ بدن، آگ سی تاباں آنکھیں
دل میں طوفان ہوا، آنکھوں سے پانی تھا رواں
دیکھ نقّاشِ ازل، نقش گرِ حُسن و جمال
نقشِ مکروہ میں بھی اپنا دکھاتا ہے کمال

خوف تھا دل میں کہ غمّاز نہ ہو میری صدا
اپنے سینہ میں دبائے ہوئے تھا اپنی فغاں
منتقل شعر میں ہو، کاش! عنادل کی نوا
کاش! ہو شاخِ شجر پر کسی شاعر کا مکاں!

---

[1] خدا کی قدرت دیکھیے کہ مرتاض کے پیکر میں چار حیوانوں کی مشابہت تھی اور چاروں عناصر خاک، نار، باد اور آب پائے جاتے تھے۔

آشیانے میں تھا، میں شاخ پہ بُلبُل کی طرح!
مضطرب عشق میں لیلیٰ کے، جو تھی گُل کی طرح

آ کے بیٹھا وہ اُسی شاخِ شجر کے نیچے
جس کی آغوش میں پائی تھی مری جاں نے اماں
اک مُرتاض تھا وہ تارکِ دنیائے دنی
اُس کے سینہ میں تھا اندوہ، تو لب پر تھی فغاں
میں نے دیکھا کہ تھا کشکول میں اس کے حلوا
کیسے نازل ہوا اس دشت میں منّ و سلوا!

اس مٹھائی سے صنم تین بنائے اس نے
ایک نقّاش کے جوہر بھی دکھائے اس نے
شکل و صورت میں وہ انسان نظر آتے تھے
نام تینوں کو وضاحت سے بتائے اس نے
سُن کے نام اپنے وہ معصوم صنم تھے حیراں
چاہتے تھے کہ کریں بات، نہ تھی منہ میں زباں

سر پہ جس بُت کے نمایاں تھی بڑی سی پگڑی

پیار سے چُوم کے مُنہ اُس کا یہ جوگی نے کہا

"اے پروہت! میرے پنڈِت، تو ہے شِکشک میرا

پروہت = مذہبی تعلیم دینے والا۔ مولوی۔ پنڈت، مولوی
شِکشک = معلم۔ اُستاد

دس برس تو نے پڑھائی مجھے بھگوت گیتا

بھگوت گیتا = ہندو دھرم کی مقدس کتاب۔ صحیح تلفظ۔ بھگوت گِتا ہے

شاستر اس کا پوِتر اور ہے ورنن بھی سپشٹ

شاستر = قانون، حکم، اصول، ضابطہ
پوِتر = پاک۔ مقدس
ورنن = بیان۔ ورنن
سپشٹ = صاف۔ واضح

اس کے دو شبد پرنتو مجھے سمجھا نہ سکا!

شبد = لفظ، کلمہ
پرنتو = لیکن

کیسے بن موہ کرے کرم کوئی اے پنڈِت!

موہ = کشش، جذب، خواہش، تمنا، دلچسپی۔
کرم = عمل صالح، کارِ خیر

مجھ کو سمجھا نہ سکا ایک بھی اس کی ادّھیا

ادھیا = باب۔ چیپٹر (CHAPTER)

مد بھری باتوں سے بھرپور ہے بھگوت کی گِتا

مُرکھ شِکشک ہو تو کیا شِشّ کرے کیا وِدّیا

مُرکھ = احمق
شِکشک = معلم
شِشّ = متعلم، شاگرد
وِدّیا = علم

سامنے میرے کھڑا ہے تو اردلی بن کر

اردلی = ملازم

تو ہی اب مجھ کو بتا کیا میں تجھے دوں شِکشا؟

شِکشا = سزا

کیا بُرا ہے، جو تو ہو پیٹ کی بھٹّی ہی میں بھسم

بھسم = غرق

ایسے بن باس میں تیرے لئے اگنی نہ چِتا"

اگنی = آگ

شاستری جی کو نگلتے ہوئے جوگی نے کہا

"پھر تو آئے گا پُنر جنم میں کیا ہے چِنتا!"

پُنر جنم = دوسرا جنم، تناسخ، دوسری زندگی
چِنتا = تشویش

ہیبتِ شر سے چھپا خیر نہ معلوم کہاں

جب دکھائی اسے ابلیس نے تیغِ برّاں

شاستری جوں ہی بنا اس کے شِکم کا ایندھن

بُتِ دوّم کو اُٹھا کر وہ ہوا یوں گویا

"دیوتا تو ہے مرا! نام گرو جی تیرا!

گرو جی = پیر و مرشد

میں بلیدان کروں تجھ پہ پِتا اور ماتا

بلیدان = قربان، تصدق
پِتا اور ماتا = ماں باپ

تیری اگیا کو سنا بات نہ کاٹی تیری

اگیا = حکم۔ فرمان

تو نے پورب کو دکھائی ہو جو پچھم کی دِشا

پچھم = صحیح لفظ پشچم یعنی مغرب
دِشا = رُخ، سمت

کرم کا تو نے ہی اُپدیش دیا تھا مجھ کو

کرم = نیک عمل
اُپدیش = وعظ، نصیحت، تعلیم

میں نے سنیاس کیا، جب ہوئی تیری اگیا

سنیاس = تارک الدنیا ہونا

واسنا کیسے مرے؟ کیسے ہو بُدّھی بلوان

واسنا = رغبت، خواہش، تمنا، میلانِ طبع
بُدّھی = عقل، خرد
بلوان = قوی

جب کہ ہو جائے اشکت اپنے ہی من کی اِچھا

اشکت = ضعیف، ناتواں
اِچھا = خواہش، تڑپ

شانتی کچھ بھی مرے تیاگ سے مجھ کو نہ ملی

دُکھ سہا، سُکھ نہ ملا، بَن میں بھی دن رات پھرا

کیا کرے کوئی پرانی جو ہو مَن اس کا بھرشٹ

راکشس بن کے گروہی کو وہ کھائے کچّا"

اب لگا نوچنے وہ اپنے گرو جی کا بدن

دست و پا قطع کئے، چوم کے ان کو کھایا

جان کس شان سے دی! ظلم پہ کھولی نہ زباں

لب پہ بسمل کے دمِ ذبح نہ تھی آہ و فغاں!

بتِ سوّم سے لرزتے ہوئے جوگی نے کہا

تو ہے بھگونت مرا، سارے جگت کا داتا!

جنتا تیری ہے، آکاش پہ پرکاش ترا

تیری شکتی کی درشٹی میں نہیں مریادا!

ستی ہے، تو نے دیا مجھ کو شریر اور پران

ایک دن ان پہ نہ کی، تو نے پرنتو کرپا!

شانتی = سکون۔ اطمینان
تیاگ = بروزن پیاس = ترک کرنا، ترک اللذات
پرانی = جاندار
بھرشٹ = ناپاک، پلید
راکشش = دیوزاد، حیوان
بھگونت = خدائے قادر
جگت = عالم
جنتا = مخلوق
آکاش = فلک، آسمان
پرکاش = نور، پرتو
درشٹی = نگاہ
مریادا = حد
ستی = سچ، صحیح
شریر = جسم
پران = جان
پرنتو = لیکن

پاپ اور پُنیہ کی شکتی پہ ہے میرا ادھکار

پھر چمتکار ہے کیا؟ میں نے گرو کو کھایا!

مُرتعش ہاتھ سے اب اُس نے اٹھایا وہ صنم

اور لرزتے ہوئے پھر اس کو زمیں پر رکھّا

ہیبت و خوف کے آثار تھے چہرے پہ عیاں

اپنے بھگوان کا اپمان وہ کیسے کرتا؟

آرہی دُور سے تھی پشتِ شُتر پر لیلیٰ

اپنا گُل دیکھ کے ہیں شاخ پہ بیتاب ہوا

میں نے للکار کے سادھو سے کہا "اے چنڈال!

بھر گئے دن ترے، اب تجھ کو چکھاتا ہوں مزا!

تو نرک کنڈ کا راون ہے، مگر اے راون!

اس صنم کو نہ بنا اپنے شکم کا ایندھن!"

سُن کے نعرہ مرا، بیہوش ہوا سنیاسی

میری للکار کو بھگوان کی سمجھا وہ ندا!

پُنیہ = نیکی
ادھکار = اختیار
چمتکار = تعجب
بھگوان = خدا
اپمان = توہین
نرک کنڈ = اسفل السافلین، [illegible]

ایک ہی آن میں میں سطحِ زمیں پر آیا
جیسے لنگور کوئی شاخِ شجر سے اُترا
صیدِ غافِل کی طرف جیسے جھپٹتا ہے عقاب
اسی انداز سے، اُس بُت کی طرف میں لپکا
غزنوی بن کے کیئے بُت کے وہیں دو ٹکڑے
تا کہ مجھ جیسے گنہگار سے راضی ہو خدا!
دو تہائی کے مساوی جو ہوا تھا ٹکڑا
نذرِ لیلیٰ کے لئے جیب میں اس کو رکھا
اِک تہائی جو تھا میزان میں اس کو میں نے
منّ وسلوا کی طرح لطف اُٹھا کر کھایا
مُنہ میں حلوا تھا کہ لیلیٰ کی سواری آئی!
گلشنِ دل میں مرے، بادِ بہاری آئی!

لطیفہ سے سبق

کسی احمق کو نہ اے شیخ! بنا اپنا مُرید
نہ بڑھا اپنی تشاویش میں تشویش مزید!
چاک کرتی ہے حماقت جو گریباں اپنا
تیری دستارِ فضیلت کی نہ ہو قطع و بُرید!
علم و حکمت کا کرم، جہل و حماقت کا ستم!
گرمِ ہنگامہ ہیں، چاروں ہی اپنے ہمدم!

پختگی فقر کی ہے فکرِ رسا[1] کے دم سے
باخبر ہے جو رہِ زُہد کے پیچ و خم سے

---

[1] قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے " وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا " (اور جس کو دین کا فہم مل جائے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی) بھگوت گیتا کا بھی یہی درس ہے کہ جب تک بُدّھی بلوان نہ ہو، یعنی خرد پختہ نہ ہو۔ معرفت کے مدارج کا طے کرنا مشکل ہے۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ بیسیوں، زاہد اور متقی کسی حادثے یا بلائے ناگہانی کے وقوع کے بعد، اپنی کم فہمی کی وجہ سے، زہد و تقویٰ سے منہ موڑ کر کفر کی طرف مائل ہو جاتے ہیں (فرید)

سازِ ہستی کی نوا عقل کی مِضراب سے ہے
آشنا ہے وہی ہر نغمہ کے زیر و بم سے

عقل مخلِص ہے، مگر نفس بھی دے اس کو مجال
کہ بتائے اُسے تریاق، بچائے سم سے

تجربے تلخ یہ ہوتے ہیں کہ فکرِ نارس
درس لیتی رہے، دانشکدہ حُزن و غم سے

عقل کیا شے ہے اگر نفس کو حاصل ہو عروج
راز پوشیدہ نہیں، حق کے کسی محرم سے

صاف رکھ آئنہ دل کا کہ میسّر ہو شہود!
کیا غرض اہلِ بصیرت کو ہے جامِ جم سے!

نقصِ اِدراک سے ہے، طاقتِ ایماں کا زوال!
قوتِ فکرِ رسا سے ہے مجاہد کا کمال!

نظم و تنظیم

یہ نظم ۱۹۵۶ء میں لکھی گئی تھی اور ماہنامہ "تذکرہ" میں چھپی تھی، جب کہ پاکستان کی سیاسی اور اقتصادی حالت ابتر تھی۔ الحمدللہ کہ آج پاکستان ہر لحاظ سے اس قدر مضبوط اور مستحکم ہے کہ اور مملکتیں اس کو رشک کی نگاہ سے دیکھ رہی ہیں۔

چمن آرا کے مساعی سے ہے شاداب چمن
ورنہ مرجائیں گل ولالۂ و نسرین و سمن

انحطاط اور تنزّل کا سبب، فسق و فجور
نظم و تنظیم کی برکت سے ہیں کشور ایمن

وحدتِ فکر و عمل رازِ عُروجِ اقوام
پیش رفت اور ترقی کے نشاں محنت و فن

صحّتِ قوم سے غفلت کا نتیجہ حسرت
ضامن حفظِ وطن، زورِ جوانانِ وطن

رونقِ زیست کا سرچشمہ ہُنرمندی و فن
بل پہ روغن کے ہے ضو پاش چراغِ روشن

سیکھ قرآن سے آئین و نظامِ دولت

رزم اور بزم کا فن، علمِ حصولِ شوکت

مسکن و آب و غذا، پارچہ و علم و دوا

اِن کی تنظیم کے مسئول ہیں حکّامِ وطن

فاقہ و فقر و فلاکت سے تو بے تاب ہو قوم

اور اربابِ حکومت ہوں تعیّش میں مگن

نغمۂ و رقص و مے و ساغر و جام و ساقی

اور اس بزمِ حیا سوز میں اِبلیس کا فن[1]

پھر بغاوت کا عَلَم قوم بھی کرتی ہے بلند

دیکھ کر طبقۂ حکّام کا یہ چال چلن

دُزدی و راہ زنی، قتل و حریق و غارت

اِن جنایات میں مٹتے ہیں فقیرانِ وطن

---

[1] بدکاری کی خواہش۔

یہ حکومت نہ ہوئی، ملک کی خدمت نہ ہوئی

مالِ ملّت کو سمجھ لے کوئی اجداد کی دھن

ظلمِ حکّام ہو اور فقر و فلاکت کا ستم

ہائے مجبور ہو انساں کہ کرے ترکِ وطن!

آگ گلشن کو لگے، ہو وہ سراپا گلخن

آرزو لے کے ہوا کیوں نہ ہوں مرغانِ چمن!

یارب! اس دولتِ نوخیز کا رہبر دیں ہو!

گام زن قوم رہے، راہ نہ ہو اس کی کٹھن!

عِلم و فن، نظم و نسق مایۂ آرائشِ قوم

ایک قرآن ہے سرچشمۂ آسائشِ قوم

بیاہ .... ازدواج

(دوشیزگان کے لئے غذائے فکر)

باغِ گاندھی میں ایک دن سرِ شام
میں تھا بیٹھا ہوا لبِ تالاب!
تھے مرے ساتھ دل کے سب احباب
یاس و حرمان و حسرت و تب و تاب!
محتسب بن کے میرا نیک ضمیر
نفسِ بدخُو سے لے رہا تھا حساب
کہہ رہا تھا کہ "آہ! اے بدجنس!
کرلیا تو نے اپنا خانہ خراب!
تیرا کردار شیطنت آمیز!
تیری گُفتار مفسدِ آداب!

کیوں نہ کردیں فرشتگانِ عذاب
تجھ کو دوزخ کی آگ میں پرتاب!"
نفسِ سرکش ہے اپنے مَن کا دھنی!
عقل سے اُس کی ایک دن نہ بنی!

سرزنش یہ ضمیر کی سُن کر
چشمِ مکّارِ نفس تھی پُرآب
دفعتہً ایک حورِ رعنا
وضع میں شبیہِ دُخترِ پنجاب
اِس ادا سے بڑھی مری جانب
مجھ سے گویا تھا اس کو شوقِ خطاب
آیتِ حُسن، رشکِ سروِ سہی
رنگِ رُخسار اُس کا رنگِ گلاب
صبحِ روشن سے صاف تر گردن
پاک تر اس سے بھی طلوعِ شباب

مرمریں جسم گیسوانِ دراز
سینہ مانندِ تختۂ سیماب
زلف ایسی جبیں پہ تھی گویا
رخِ زہرہ پہ آگیا تھا سحاب
کیسی بھرپور نور سے آنکھیں
اس کی موجِ نگاہ رشکِ شہاب
مسکراتی ہوئی چھپاتی تھی!
سر جھکا کر وہ اپنی حسنِ حجاب
دیکھ کر یہ جمال، دل نے کہا
"ہے یہ نیرنگیٔ خیال، کہ خواب؟
وائے! اے سحرِ بے پناہِ جمال!
تونے تقویٰ کو کردیا پامال!"

"راہ لے اپنی!" میں نے اس سے کہا
"مجھ میں باقی نہیں جنونِ شباب

کہ ترے آستاں پہ آ بیٹھوں
اور تری یاد میں رہوں بیتاب!
باغِ عالم کا میں ہوں خشک شجر
اور تو مثلِ شاخِ تر، شاداب!
سطحِ گیتی پہ پیرِ مردِ نحیف
موجِ دریا پہ جیسے کوئی حباب!
کٹ رہی ہے طنابِ عمر مری
اور ہے جانِ عزیز پا بہ رکاب!
پیرِ فرتوت شاب کے آگے
پیشِ طاؤس بدقیافہ غراب!
کب ہوئے ہیں خوشی سے ہم آغوش
زشتیٔ پیری و جمالِ شباب!
زندگی کی شکست ہے پیری!
رجعتِ قہقری و دلگیری!

اُس نے ہنستے ہوئے کہا کہ "جناب

بے سبب آپ کا ہے مجھ پہ عتاب!

چاہتی آپ سے ہوں اِذنِ خطاب

میرا منشا فقط سوال و جواب

نہیں پیری کی شان کے شایاں

دمِ گفتار یہ شتاب و عتاب

قابلِ احترام ہے پیری

مستحقّ نوازشِ القاب

واجدِ دانش و خرد پیری

فاقدِ فہم و آگہی ہے شباب

علم و حکمت کی کان ہے پیری

ہر دلِ پیر تجربوں کی کتاب!

اِس لئے چاہتا ہے فہم مرا

آپ کے تجربے سے اِستصواب

ڈال دیتی ہے فکر و حکمتِ پیر

سو بلاؤں کے پاؤں میں زنجیر

دو[۲] ہیں دنیا میں میرے دلدادہ

دونوں ہیں میرے عشق میں بیتاب

ہے امیر ایک، دوسرا ہے فقیر

دونوں خوش رو ہیں، دونوں اہلِ شباب

سیم و زر سے ہے ایک مالا مال

مشغلہ اس کا ہے، قِمار و شراب

دوسرا زاہدِ فقیر و حقیر

رات بھر ذکر و فکر میں بیخواب

اس کو فرصت نہیں ریاضت سے

کہ کرے اہتمامِ نان و آب

میرے مجذوب دل کو چین نہیں

ہے جمال اس کا اس قدر جذّاب!

کیا بتاؤں عذابِ سوزِ دروں

دل ہے، یا آگ پر ہے کوئی کباب!

دیکھ کر اس کا والہانہ نیاز

ناز میں اب نہیں ہے صبر کی تاب

اے خوشا! نغمہ ہائے بزمِ شباب!

عشق ہے ساز، حُسن ہے مضراب!

میں ہوں مجبور، وائے لاعلمی

کب حقیقت کو دیکھتا ہے شباب

کیا کروں کس سے میں بیاہ کروں؟

آپ کے فہم سے ہے استصواب

"عقل پر ضربِ عشق ہے کاری

کیسی بے خود ہوئی ہے بیچاری!"

کیا تھی اس کے بیاں میں شیوائی

اُس کی آواز رشکِ چنگ و رباب

مُسکراتے ہوئے کہا میں نے

"حُسن اشاروں میں ہے یہ میرا جواب

حُسن وہ، جس میں حُسنِ خُلق نہ ہو

تِشنہ لَب عشق کے لئے ہے سراب

فقر و اِفلاسِ زاہدِ بے بس

اُس کے محبوب کے لئے ہے عذاب

فاقہ مست ایک، دوسرا مے خوار

ایسے عشّاق ہر گلی میں ہزار

عیش دو دن کا، عمر بھر کا عذاب

عشق کی داستاں کا لُبِّ لُباب

کیوں تجھے ہے بیاہ کی جلدی؟

کر نہ عجلت میں اپنا خانہ خراب!

یاد رکھ یہ کہ ہے خدائے کریم

کارساز و مسبّبُ الاسباب!

عشق ہے اُس جواں کا زُود گذر

حُسنِ اندام پر ہے جس کی نظر!"

اس نظم میں ہر دوشیزہ کے لئے نصیحت ہے کہ وہ کسی بوڑھے سے (جیسا کہ خود شاعر ہے)۔ کسی ثروتمند عیش پرست، آوارہ منش جوان سے یا کسی مفلس زاہد سے جسے فکرِ معاش نہ ہو، ازدواج نہ کرے۔

تبلیغ

(اسلامی مملکتوں کی توجہ تبلیغ کی طرف مطلق نہیں ہے)

اے مسلمان! بہت تو نے اِدارے کھولے

دُنیوی کام ترازوئے خِرد میں تولے

شک نہیں اس میں کہ تو اپنے وطن پہ ہے نثار

قوم کے جام میں تعویذ بھی تو نے گھولے!

باغِ دیں ہے ترے کِشور میں مگر خشک و خموش

گُل گُلستاں میں ہو موجود تو بلبُل بولے

مملکت کا ہے نگہبان سیاست کا شعور

تیرے جمہُور کے افراد ہیں یکسر بھولے

اوّلیں فرض مسلماں کا ہے تطہیرِ قُلوب

تیری گنگا ہے رواں، نفسِ بشر کو دھولے

گرچہ ماخوذ ہے اسلام سے تیرا آئین

اس میں اسلام کی تبلیغ پہ اک حرف نہیں!

ایمان وعمل ۔ زہد وتقویٰ

محفلِ دہر میں جب تک ہے فسونِ شیریں

عشقِ فرہاد بھی ہو گا نہ کبھی گوشہ نشیں!

باغِ محنت کے ثمر لطف وکمال واعزاز

ہے گلستاں میں تگ ودو سے صبا عطر آگیں

لاکھ فتنے ہوں کمیں گاہِ فلک میں لیکن!

مردِ مومن کبھی آفات سے مرعوب نہیں

سازشیں لاکھ کرے حکمتِ ابلیسِ لعیں

شر سے محفوظ ہے وہ، سجدہ میں ہے جسکی جبیں

شورانگیزیٔ طوفان وتلاطم رک جائے

ہو دوچار اس سے اگر قوتِ ایمان ویقیں

جذب سے فقرِ مسلماں کے ہیں تارے لرزاں

کہ کہیں کھینچ نہ لے جائے انہیں سوئے زمیں!

قوتِ زہد وتُقا اصل میں ہے دستِ خدا

ہے یہی عینِ حقیقت کوئی تمثیل نہیں!

گو حوادث سے لرز جائیں زمیں اور زماں

ہر مسلماں کے لئے حصنِ حصیں ہے ایماں!

اِنسان سے بیزاری

MISANTHROPY

بعض بدنصیب اشخاص کو مجبوراً ایسے ناسازگار ماحول میں رہنا پڑتا ہے جہاں اُنہیں فطرتِ انسانی کی شرارتوں اور خباثتوں کا تلخ تجربہ ہوتا ہے۔ ان کی اولاد جن کی پرورش اور تربیت پر وہ بے دریغ طاقت اور دولت صرف کرتے ہیں، احسان فراموش ہوتی ہے۔ ان کے بعض رشتہ دار ان سے خواہ مخواہ بدسلوکی کرتے ہیں۔ بعض دوست اُنہیں دھوکہ دیتے ہیں۔ جن پر ان کے احسانات ہوتے ہیں، وہی ان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ ان بدسلوکیوں کا نفسیاتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے بدنصیب اشخاص بنی نوعِ انسان سے بیزار ہو جاتے ہیں، اور ان سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اس نفسیاتی حالت کو انگریزی میں MISANTHROPY یعنی "انسان سے بیزاری" کہتے ہیں۔ اس نظم کے پہلے بند میں ایسے ہی اشخاص کی ذہنی کیفیت کا ذکر ہے۔ قرآنِ کریم کی آیات اور احادیثِ نبوی میں سخت تاکید آئی ہے کہ

انسان عقل سے کام لے، اچھے اور بُرے انسانوں کو پہچانے اور بلا وجہ ہر شخص سے بدگمان نہ ہو، اور اُسے بُرا نہ سمجھے۔ اسلام نے بخشش، عفو، درگذر، اور اِغماض کی تلقین کی ہے۔

نوعِ انساں کی شقاوت سے ہوا ہوں بیزار
اِس زمانہ میں نہیں کوئی کسی کا غم خوار

حیلہ و کذب و دغا، کبر و ریا، جَور و جفا
ہائے! اِس عصر میں انساں کا یہی ہے کردار

ظاہراً نیک، تو باطن میں شریر و مجُرم
وائے! ہر پیکرِ انساں میں چھپا ہے مکّار

ہوں گے موجود بھلے لوگ جہاں میں لیکن
واسطہ جن سے پڑا مجھ کو وہ نکلے اشرار

دَورِ حاضر میں جوانوں کے مشاغل کیا ہیں؟
نغمہ و بادہ کشی، حُبِّ زناں، رقص و قمار

حُسنِ اخلاق کو اِلحاد نے پامال کیا

ہے ہنر ایک کسی میں تو عیوب اُس میں ہزار

آدمی جائے کہاں! ہے بھی کوئی ایسا مکاں؟

جس سے حاصل ہو دلِ خستہ کو تسکین و قرار

آہ! اے غمزدہ انسانِ ضعیف البُنیاں

بیکسی لے کے تو کہسار میں دن اپنے گزار

تھی یہی وجہ کہ عُزلت سے تھی راحت دل کو

چین دیتا تھا مجھے گورِ غریباں کا جوار

قبر کے قُرب سے ملتا تھا مرے دل کو سکوں

لُطف دیتا تھا وہیں مجھ کو ہجومِ افکار

گور کے رُعب سے ہوتا ہے ہوَا نفس کا شور

ہے مزاروں کی خموشی میں فسونِ گفتار

رتبۂ شاہ و گدا پر ہے مؤرّخ کی نظر

ہمنشیں تینوں کے ہیں قبر میں کنکر پتھر

لیکن افسوس! کہ اِس لُطف سے محروم ہوں میں

اب ہے وحشت کا سبب میرے لئے قُربِ مزار

صحّتِ فکر و تخیّل کا نہیں ہے معیار

حالتِ نفس کا افکار پہ ہے دار و مدار

کیا سُنا تو نے؟ غلط بات بتائی میں نے

نفسِ خودخواہ کا افکار پہ ہوتا ہے فشار

حکمِ دیں سُن! کہ ہے جبروتِ خدائے جبّار

نفس و ادراک کی جنبش کی مدیر و مختار

نفس و اِدراک پہ انساں کا تسلّط ہے محال

علم و اخلاق کی تحصیل بھی کارِ دشوار

وائے! مجبوری و بے مائگیٔ مُشتِ تراب

ہے مگر اس کو اِسی زیست پہ کتنا اِصرار

نہیں انساں کے اِرادوں میں دوام اور ثبات

عزم، آفات کی یلغار سے پاتا ہے وفات

تھا کسی وقت مرا ایک انیس و غمخوار
مۓ وحدت سے تھا دل جس کا ہمیشہ سرشار
استعارہ مرا کرتا ہے ستائش اُس کی
تھے نہاں عجز کی کملی میں کمالات ہزار
پاک دل، پاک نظر، پاک دہن، پاک نژاد
اُس کے چہرے سے جھلکتا تھا تزہّد کا وقار
مرا ہمدم ہوا اِک روز جو پیوندِ زمیں
ہو گیا دل کو مری شومیٔ قسمت کا یقیں

اُس کے مرقد پہ گیا فاتحہ خوانی کے لئے
ہو رہی تھی میرے اشکوں سے خجل شمعِ مزار
گرمیٔ گریہ سے گر خشک نہ ہو کر مٹتے
ٹھوس اشکوں کا وہاں آج بھی ہوتا انبار

کیا ہے یہ "سوزِ دروں[1]؟" خادمِ سودا و جنوں
موجدِ وحشت و آتش زنِ آرام و سکوں

مرے آنسو تھے رواں، دل میں یہ خواہش تھی نہاں
کاش پہلو میں جگہ دے مجھے میرا غمخوار
رنج و غم، درد و الم، چرخِ جفاجو کا ستم
کس قدر تلخ ہیں اس عمرِ رواں کے ادوار
ناگہاں قبر سے انسان کی آواز آئی
دلِ گمرہ کے لئے پند و نصیحت لائی

---

[1] "سوزِ دروں" کی تعریف و توصیف میں مضامین و اشعار لکھے جاتے ہیں "سوزِ دروں" ہماری غزلوں کی جان ہے۔ باوجود اس کے میرا اپنا عقیدہ یہ ہے کہ، مومن جس میں ایمان توکّل اور نیکی ہو ایک مطمئن اور فارغ البال انسان ہوتا ہے۔ اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ یہاں تک کہ بھگوت گیتا میں بھی جو ہندو دھرم کی مقدّس کتاب ہے، یہی تعلیم دی گئی ہے کہ روحانیت کی ترقی کے لئے اطمینانِ قلب یا سکونِ دل شرط ہے۔

ہوا معلوم تہہِ قبر فرشتوں کی تھی بزم
جس میں تھا گرمِ سخن میرا قدیمی غم خوار
سُن یہی میری حمایت میں تھے اُس کے الفاظ
"کیا دلآویز تھی مرحوم کی طرزِ گفتار
کیوں نہ ہوتی مجھے اُس مردِ خدا سے اُلفت
کہ ستائش کا سزاوار تھا اُس کا کردار
مجھ کو محبوب تھے اوصاف و محاسن اُس کے
آدمی ذوقِ محبت کا نہیں ہے مختار!"
اِک فرشتہ نے کہا: "یہ تو حقیقت تھی مگر
اب وہ انسان کی صحبت سے ہوا ہے بیزار
دیکھتا ہے وہ خطاؤں کو بہ اندازِ عتاب
اُس کی آنکھوں میں مئے کبر کا باقی ہے خُمار
طینتِ تیرہ دروں، من کی جلن، دل کا غبار
عفو و اِغماض و کرم، اہلِ بصیرت کا شعار

عیب دیکھے جو کسی کے وہ ہنر بھی دیکھے
اہلِ بینش کے پرکھنے کا یہی ہے معیار
اُنس انساں سے نہیں جس کو نہیں وہ انساں
کیوں نہ حیوانوں کی فہرست میں ہو اس کا شمار!"
نام حیوان کا سُن کر میں بہ عجلت اُٹھا!
چوم کر مونسِ مرحوم کا تعویذِ مزار!
تیز تر تیرِ مجاہد سے تھی میری رفتار
قابلِ دید تھا واللہ! وہ اندازِ فرار
فِکر میں ہوتی ہیں انساں سے خطائیں کیا کیا
آدمی نفس پہ کرتا ہے جفائیں کیا کیا

کشمکشِ زندگی

مرا دل عشرت و آسائشِ جنت سے اُکتایا
مجھے ذوقِ تگ و دو ، دارِ فانی میں اُٹھا لایا
مقیّد قالبِ خاکی میں دیکھی میں نے جاں اپنی
مگر اس بے بصر قیدی کو زنداں میں بھی لطف آیا
وسائل عیش اندوزی کے بکھرے ہر جگہ پائے
تماشا گاہِ عالم کا ، تماشا بھی مجھے بھایا
تمنائیں اُٹھیں ، بن کر سنور کر ، محفلِ دل میں
مگر اِن فتنہ پردازوں کے فتنوں نے غضب ڈھایا
وہ پایا ، جو نہ چاہا تھا ، جو چاہا ، وہ نہ ہاتھ آیا
پلٹ دی زندگی کی گردشِ افلاک نے کایا

مرادیں بھی جو بر آئیں ، تقاضے دل کے بڑھتے تھے
ہوس کی فتنہ پردازی نے ساری عمر تڑپایا
خرد اور تجربے کی سرزنش بھی بے اثر ٹھیری
دلِ ناداں نہ آخر اپنی ہٹ دھرمی سے باز آیا
حوادث ، رنج و غم ، آفات اور آلام ، کیا کم تھے؟
مجھے پھر کیا یہ سوجھی ، عشقِ غارت گر کو اپنایا!
رُلایا عشق نے برسوں ، صنم آخر نہ ہاتھ آیا
کنول سا میرا دل تھا ، سوزِ غم سے جل مرجھایا
مِلا بدلہ وفا کا ، عشق کا انجام بھی دیکھا
کہوں کس سے کہ میرا گھر ، مرے محبوب نے ڈھایا!
نہ ہوتن کی کبھی سُدھ جس کو ، کہاں شوقِ نمود اسکو
کوئی عاشق کبھی چاکِ گریباں سے نہ شرمایا
تڑپتا رہ گیا دل ، اور ترستی رہ گئیں آنکھیں
جہاں میں عیش کا سامان نہ کچھ بھی میرے کام آیا!

عذابِ زندگی سے تنگ آکر، جب کبھی رویا
تو آنسو پوچھ کر، اُمید نے دل میرا بہلایا
مگر یوں مادرِ اُمید بہلاتی رہی مجھکو
کہ جیسے طفلکِ ناداں کو بہلائے، کوئی دایا!
نہ عقدہ کھل سکا، نفس و خرد میں کشمکش کیوں ہے
میں طالب آشتی کا، ان کی ناچاقی سے گھبرایا!
خرد کہنے لگی، "حرص و ہوس سے تونے کیا پایا؟
سکون و لطفِ جاں کھویا، لٹایا دل کا سرمایا!
کہاں ذوقِ عمل اسمیں، کہاں شوقِ جہانبانی
ترانہ جس نے ساری عمر، حسن و عشق کا گایا!
کہاں کردار کی وہ جاذبیّت، حسنِ صورت ہیں
حسیں وہ صاحبِ سیرت ہیں، جو مشکل ہیں کام آیا!
ابھی باتیں خرد کی سن رہا تھا میں توجہ سے
کہ اس اثنا میں، عزرائیل پیغامِ اجل لایا!

بہت سے تھے نوحہ خواں، جو محفلِ ماتم میں کہتے تھے
بڑا ہی باکمال انساں تھا جس کو ہم نے دفنایا!
ہوس کی فتنہ جوئی سے ہے رونق بزمِ عالم میں
فریدِ نکتہ داں نے کیوں نہ اِس نکتے کو سمجھایا؟
تمنا کیا ہے؟ اس کی ابتدا و انتہا کیا ہے؟
یہ رازِ انساں نہ سمجھا، اے خدا تو ہی بتا کیا ہے!

مدیرِ "تذکرہ" کے تقاضے سے یہ نظم "تذکرہ" کے سالنامے میں نامکمل حالت میں چھپ گئی تھی بہت کچھ ردوبدل کر کے اور بہت سے اشعار بڑھا کر اسے مکمل کیا گیا ہے۔

منظوم افسانوں، قصیدوں، مرثیوں، غزلوں اور رباعیوں میں شاعر کے دل میں جو بھی خیال پیدا ہوتا ہے، اسے وہ منظوم کر لیتا ہے۔ اس قسم کی منظومات میں الفاظ کی مناسبت سے شاعر اپنا خیال شعر میں ڈھالتا ہے، خواہ اس کے افکار و اشعار میں ربط اور تسلسل ہو یا نہ ہو۔ ایک شب دل میں خیال گزرا، کیا ٹھوس، خشک اور معرّف فلسفیانہ مضامین سلسلہ وار منظوم ہو سکتے ہیں؟ اگر منظوم ہو سکتے ہیں تو ایسی نظم کی کیا شکل ہوگی۔ ظاہر ہے کہ مضامین کی گہرائی پیچیدگی اور خشکی کی وجہ سے اس قسم کی نظم میں غزل کی لطافت و دلکشی نہیں پیدا ہو سکتی تاہم کوشش کی تو علم کے موضوع پر ذیل کی نظم بن گئی۔ اچھی ہے یا بری یہ تو قارئین جانیں۔

علم کے موضوع پر فلسفہ کے مختلف مدارس اپنے اپنے نظریات پیش کرتے ہیں۔ ان مدارس میں چار اہم مدرسوں کے نظریات ذیل کی نظم میں منظوم کیے گئے ہیں۔ اس نظم میں علم سے متعلق اسلامی تعلیم کے اشارات بھی ہیں۔ اسلام کی نگاہ میں فلسفہ کے یہ نظریات، لغویات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ ان کے لغو ہونے کا بیّن ثبوت یہ ہے، کہ فلسفہ کا ہر مدرسہ، دوسرے مدارس کے نظریات کی تردید کرتا ہے۔ فلسفہ محض ذہنی تعیّش کا سامان ہے۔ اس سے کچھ حاصل نہیں۔ امام غزالیؒ نے اپنے زمانے کے رائج فلسفہ کی دھجیاں بکھیر دیں، اور اس گمراہ کن فلسفہ سے دینی عقائد میں جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے، ان کا ازالہ کیا۔ البتہ سائینس اور ٹیکنالوجی (SCIENCE AND TECHNOLOGY) کے علوم دنیاوی مقاصد کے لئے بے حد مفید ہیں، اور علم منطق بھی ایک کارآمد علم ہے جو فکرِ صحیح کا طریقہ سکھاتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں علم سے متعلق صدہا آیات ہیں، جو پُرزور الفاظ میں بتاتی ہیں، کہ خداوندِ متعال علم کا سرچشمہ ہے۔ وہی علم کا مالک ہے، وہی علم پر قابض ہے، وہی اپنے علم بے پایاں کا ایک جزء حسبِ ضرورت اپنے بندوں کو عطا فرماتا ہے۔ یہ انسان کے بس کی بات نہیں، کہ اللہ تعالیٰ کے علم کا شمّہ برابر حصّہ بھی، اس کے حکم اور اجازت کے بغیر اپنی قوتِ فکر سے حاصل کر سکے۔

اس باب میں قرآن حکیم کے تفصیلی مطالعے کی ضرورت
نہیں۔ چند آیات ہی اس نکتہ کو روزِ روشن کی طرح واضح کر دیتی ہیں۔
دیکھئے سورہ ۹۶ العلق آیت ۳، ۴، ۵، ۶

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ
عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۭ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓى ۙ

پڑھ اور تیرا پروردگار بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے
علم سکھایا، اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جس کا اسے علم
نہ تھا، لیکن انسان سرکش ہو جاتا ہے۔

مذکورہ آیات سے ظاہر ہے کہ علمِ انسانی کا معلّم صرف
اللہ تعالیٰ ہے۔

سورہ ۲ البقرہ آیت ۲۵۵ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ
مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ

جو کچھ لوگوں کے روبرو ہو رہا ہے اور جو کچھ اُن کے
پسِ پشت ہوتا ہے، اس کا اللہ تعالیٰ کو علم ہے،
اور یہ اُن کے بس کی بات نہیں، کہ وہ اس کے علم کے
کسی جزء کو حاصل کر سکیں، بجز اُس علم کے جس کو وہ
چاہے کہ انسان حاصل کرے۔

ان آیات کے مطالعے کے بعد، ہر صحیح الفکر
مسلمان اس حقیقت کو تسلیم کرے گا، کہ انسان جو بھی علم حاصل
کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ ہوتا ہے۔ سائنسدانوں

پر مادی قوتوں سے متعلق، آئے دن جو نئے نئے انکشافات
ہوتے رہتے ہیں، وہ خدا ہی کے حکم سے ہوتے ہیں۔
دورِ حاضر میں، اللہ تعالیٰ نے چاہا، کہ انسان کو جوہری توانائی
کا علم ہو پس ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم (ATOMIC AND
HYDROGEN BOMBS) اللہ تعالیٰ کی مرضی
ہی سے ایجاد ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں، علم سے متعلق اگر
دیگر قرآنی آیات پر بحث کی جائے تو صدہا صفحات کافی نہ
ہوں گے۔

"خودی" پر میرا اعتراض

انسان تین چیزوں سے مرکب ہے۔ جسم، عقل
اور نفس ـــ مرنے کے بعد یہ جسم جو خاک سے بنا ہوا ہے۔
خاک میں مِل جاتا ہے، دنیوی عقل بھی جسم کے ساتھ ہی ختم
ہو جاتی ہے۔ بارگاہِ ایزدی سے علم انسان کے نفس ہی
کو ودیعت ہوتا ہے۔ نفس اپنے دنیوی علم اور تجربوں کو
ساتھ لے کر دوسری دنیا کی جانب کوچ کرتا ہے۔ پس اصل
انسان صرف نفس ہی ہے، جسے روزمرہ کی بولی میں ہم جان
کہتے ہیں۔ لفظِ "روح" لفظ "نفس" کا مترادف نہیں۔
روح کی حقیقت جداگانہ ہے۔ اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے
"سورۂ قدر" کی تفسیر کا مطالعہ ضروری ہے۔

قرآنِ کریم کی ساری تعلیم کا موضوع انسان کا

نفس ہی ہے ، جسے تعلیم و تربیت کے لئے ایک خاکی
پیکر میں اس دنیا میں بھیجا جاتا ہے ۔ نفس ہی انسان کے
کردار کا ذمہ دار ہے ، اسی کی آزمائش ہوگی ، اِسی سے
پرسش ہوگی ، یہی جنت میں داخل ہو کر اس کے عیش و
عشرت سے لطف اندوز ہوگا اور یہی واصل بہ جہنم ہوگا ۔ دیکھئے
سورہ ۸۹ الفجر آیت ۲۷ ، ۲۸ ، ۲۹ ، ۳۰ میں اللہ تعالےٰ
کا ارشاد ہے ۔

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً
مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝

اے اطمینان پانے والے نفس ! اپنے رب کی طرف لوٹ آ ۔
تو اس سے راضی ، وہ تجھ سے راضی ۔ میرے نیک بندوں کی
جماعت میں شریک ہو جا ، اور میری جنت میں داخل ہو جا ۔

ان آیاتِ مقدسہ سے واضح ہوتا ہے کہ موت کے بعد انسان کا
نفس ہی عقبیٰ میں جائے گا ، اور وہاں سزا و جزا کا مستحق ہوگا ۔
نفس اصلِ انسان ہے ، اس کا دوسرا ثبوت
سورہ ۳۹ الزمر آیت ۴۲ سے ملتا ہے ۔

اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ
فِي مَنَامِهَا ۖ فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ
وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ
لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝

"اللہ تعالیٰ انسانوں کے نفسوں کو ان کی موت کے وقت،

اور جو لوگ مرے نہیں ، ان کے نفسوں کو نیند میں
کھینچ لیتا ہے ۔ وہ اس انسان کے نفس کو روک لیتا ہے
جس پر موت کا حکم ہو چکا ہے ، اور دوسرے نفسوں
کو ایک وقتِ مقررّہ کے لیئے واپس بھیج دیتا ہے ۔ غور
کرنے والوں کے لیئے اس میں نشانیاں ہیں "۔

دنیوی علم نفس کے حافظے میں محفوظ رہتا ہے ،
عقبیٰ میں وہ اسے نہیں بھولتا ۔ اگر عقبیٰ میں نفس کا حافظہ ختم
ہو جائے تو پھر سزا اور جزا کا سوال ہی وہاں پیدا نہیں ہو سکتا
اس حالت میں نفس کا ایک ہی جواب ہوگا ، اور وہ یہ کہ ،
مجھے یاد نہیں میں دنیا میں کیا تھا اور میں نے دنیا میں کیا کچھ کیا ۔
قرآن کریم کی تعلیم ہے کہ نفس اپنی ایک ایک حرکت جو وہ دنیا
میں کر چکا ہے ، عقبیٰ میں یاد رکھے گا ۔ ہر نیکی اور بدی ، جو
اس نے دنیا میں کی ، اسے یاد ہوگی ۔ سورہ ۹۹ الزلزال ،
آیت ۴ ، ۵ ، ۶ ، ۷ ، ۸ میں اللہ تعالےٰ نے یہ بات واضح کر دی
ہے ۔

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا
أَعْمَالَهُمْ ۝ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝
وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝

"اس دن لوگ جماعتوں اور گروہوں میں نکل آئیں گے ،
تاکہ ان کو ان کے اعمال دکھائے جائیں ۔ پس جس نے

ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے
ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا"۔
اگر نفس کو حافظہ نہ ہوگا تو وہ کیسے اپنے اعمال دیکھے گا۔

نفس کو عقبیٰ میں ایک مخصوص پیکر عطا ہوگا جس کی
نوعیت کا ہمیں علم نہیں۔ سورہ ۵۶ الواقعہ میں اللہ تعالےٰ
فرماتا ہے۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ۙ
عَلَىٰ أَن نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

"ہم نے تمہارے لئے موت مقدر کردی اور ہم اس بات
سے عاجز نہیں کہ تمھاری طرح اور انسانوں کو تمھاری
جگہ لے آئیں، اور تم کو ایسے پیکر میں از سر نو پیدا
کریں جس کا تمھیں علم نہیں۔"

ان آیات کے مطالعے کے بعد اس میں کیا شک و شبہ رہ جاتا
ہے کہ نفس ہی ہے جو ایک خاص پیکر میں عقبیٰ میں رہے گا،
اور ارتقا کے منازل طے کرکے اعلیٰ مراتب حاصل کرے گا۔
(دیکھئے سورہ ۸۴ الانشقاق آیت ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹)

فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۙ
وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ۙ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ ۝

"شام کی سرخی کی قسم، رات کی قسم، اور جن چیزوں کو وہ
اٹھاتی ہے اس کی قسم، اور چاند کی قسم جب وہ کامل ہو جائے،
کہ تم بتدریج ترقی کے منازل طے کرکے اعلیٰ رتبوں پر پہنچتے
رہو گے۔"

اللہ تعالےٰ کے نزدیک نفس کی کیا شان ہے،
اور اس کا کیا مرتبہ ہے، اس کا اندازہ سورہ والشمس کے
مطالعے سے ہو سکتا ہے۔ نفسِ انسانی سے متعلق خداوندِ کریم
نے ایک نہیں متواتر گیارہ قسمیں کھائی ہیں اور ان گیارہ قسموں
کے حوالے سے صرف ایک ہی بات بتائی ہے اور وہ یہ کہ
"فلاح پائی اس نے جس نے اپنے نفس کو سنوارا، اور تباہ
ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو آلودہ کیا" دیکھئے سورہ ۹۱،
والشمس آیات ۱ تا ۱۰۔

وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا ۝ وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَاهَا ۝ وَالنَّهَارِ
إِذَا جَلَّاهَا ۝ وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا ۝ وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا ۝
وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَاهَا ۝ وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝ فَأَلْهَمَهَا
فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۝ قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا ۝
وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا ۝

مذکورہ بالا آیات مقدسہ میں نفس کے متعلق اللہ تعالےٰ
کی گیارہ قسمیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سورج کی قسم
۲۔ اس کی روشنی کی قسم۔
۳۔ چاند کی قسم جب اس کے پیچھے نکلے۔
۴۔ دن کی قسم جب روشن ہو۔
۵۔ رات کی قسم جب اسے چھپالے
۶۔ آسمان کی قسم۔

۷- اس ذات کی قسم جس نے اسے بنایا -

۸- زمین کی قسم -

۹- اس ذات کی قسم جس نے اسے پھیلایا -

۱۰- نفس کی قسم -

۱۱- اس ذات کی قسم جس نے نفس کو برابر کیا پھر نیکی بدی کا علم اس کو سمجھایا -

۱۲- فلاح پائی اس نے جس نے نفس کو پاکیزہ بنایا، اور تباہ ہوا وہ جس نے اسے آلودہ کیا -

گیارہویں آیت سے یہ بات ذہن نشین ہوتی ہے کہ نیکی اور بدی کا علم نفس ہی کو دیا جاتا ہے -

ہم اپنی دعاؤں میں بھی نفس ہی کا ذکر کرتے ہیں- حضرت آدم علیہ السلام کو جب جنت سے نکالا گیا، تو انھوں نے اپنے خطاکار نفس ہی کا ماتم کیا اور فرمایا:-

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ

اے ہمارے رب ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم خسارے میں رہیں گے -

احادیثِ نبوی میں بھی نفس کا ذکر بار بار آیا ہے- رسولِ کریم کے سکھلائے ہوئے خطبہ میں جو حدیث میں درج ہے نفس ہی کا ذکر ہے:-

نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا -

ہم اللہ کے پاس پناہ مانگتے ہیں اپنے نفسوں کی شرارتوں سے اور اپنے اعمال کی برائیوں سے -

عمرانِ ابنِ حسین سے، ترمذی کی روایت ہے، کہ رسولِ اکرمؐ نے ان کے والد کو یہ دُعا سکھلائی -

اَللّٰھُمَّ اَلْھِمْنِیْ رُشْدِیْ وَاَعِذْنِیْ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ

اے اللہ مجھے سیدھا راستہ دکھا اور مجھے اپنے نفس کے شر سے بچا -

اس حدیث میں بھی نفس ہی کا ذکر ہے -

اِن آیات، احادیث اور دعاؤں سے واضح ہوتا ہے کہ نفس ہی اصلِ انسان ہے - تعجب ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے کلمہ "نفس" کو جو قرآن کی تعلیم کی جان اور اس کا پسندیدہ لفظ ہے، جو شام و سحر رسول اللہ کی زبانِ مبارک پر رہتا تھا، جس کے مفہوم کو ہر مسلمان بخوبی سمجھتا ہے، ترک کر کے کیوں لفظ "خودی" کو پسند فرمایا -

علامہ کے فلسفہ کی آمیزش نے ان کی "خودی" کی تعلیم کو مبہم کردیا ہے، تاہم خودی سے متعلق ان کی تعلیم اسلامی تعلیم کی تردید نہیں کرتی، اور خودی سے ان کی مراد نفس ہی معلوم ہوتی ہے - لیکن اکثر لوگ علامہ کی "خودی" کو "نفس" کا مترادف نہیں مانتے - یہی وجہ ہے کہ ہزاروں نوجوان جو

قرآنی تعلیم سے کماحقہ واقف نہیں، اس غیرمانوس اور مذموم لفظ کی وجہ سے گمراہ ہو رہے ہیں۔

علامہ کے ذہن نے لفظ خودی کو کیوں پسند فرمایا

اس سلسلے میں اردو کے بعض اہلِ قلم مثلاً خلیفہ عبدالحکیم اپنے مضمون " رومی، نیٹشے اور اقبال " میں لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال نے خودی کی تربیت اور ارتقا کی تلقین نیٹشے کے فلسفہ سے متاثر ہوکر کی ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ خود علامہ مرحوم نے اپنے ایک مکتوب میں جو انہوں نے "اسرارِ خودی" کے مترجم پروفیسر نکلسن کو لکھا تھا، اس الزام کی تردید کی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اعتراف کیا ہے کہ ان کے اور نیٹشے کے افکار میں تشابہ ہے۔

نیٹشے چنگیز خانی طرزِ فکر کا ایک جرمن فیلسوف شاعر ہوگزرا ہے جسکی تعلیم ہے، کہ انسان بہر صورت مقتدر اور فوق البشر (SUPERMAN) بننے کی کوشش کرے۔ اس کے فلسفے کا ماحصل یہ ہے کہ آدمی کا مقصود و مرام، اور کمالِ مطلوب حصولِ اقتدار ہو، اور تحصیل اقتدار کی راہ میں جو دینی، اخلاقی یا سیاسی رکاوٹیں حائل ہوں، ان کو روندتا ہوا آگے بڑھے۔ اس کی رائے میں قابلِ ستائش وہ اقتدار ہے جو ایک انسان کو بنی نوعِ انسان کے ایک بڑے طبقے پر حاصل ہو۔ نیٹشے کا شیطانی فلسفہ ہٹلر جیسے ظالم، جابر اور فاسق افراد ہی معاشرہ میں پیدا کرسکتا ہے۔ ہٹلر کے دورِ حکومت میں یہودیوں

پر جو بہیمانہ مظالم ڈھائے گئے، اور جس بے دردی سے ان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی گئی اس کا ایک بڑا سبب نیٹشے ہی کا اہرمنی فلسفہ تھا۔ نیٹشے کے فلسفہ سے متعلق دیکھئے۔ ہسٹری آف فلاسفی صفحہ ۶۷۹ مصنفہ ولہلم ونڈ لینڈ۔

HISTORY OF PHILOSOPHY BY WILHELM WINDELBAND. PAGE 679

یہ مخبوط الحواس شاعر جسے اہلِ جرمن فلسفی مانتے ہیں، بالآخر پاگل ہوکر مرگیا۔

علامہ کی تعلیم کو نیٹشے کے فلسفہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرحوم نے فیشٹے کی " ایگو" (EGO) یعنی خودی کی تعلیم سے متاثر ہوکر " خودی" کی تربیت اور ارتقا کی تلقین کی ہے۔ علامہ مرحوم رومی اور دیگر صوفیا کے افکار سے بھی متاثر معلوم ہوتے ہیں۔

میرا اعتراض اقبال مرحوم کی تعلیم پر نہیں بلکہ صرف لفظِ " خودی " کے رواج دینے پر ہے، جو " نفس" کا نہیں بلکہ " ایگو" (EGO) کا صحیح ترجمہ ہے۔ خودی ایک مکروہ کلمہ ہے۔ علامہ مرحوم نے اپنے فلسفے کے زور سے اسے محبوب بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے نوجوان خودی سے متعلق جب علامہ کا فلسفہ پڑھتے ہیں تو قرآنِ حکیم کی تعلیم کا خیال بھی ان کے دل میں نہیں گزرتا۔ ان کی توجہ فوراً نیٹشے کے (SUPERMAN) یعنی انسانِ اعظم اور فیشٹے

کی ایگو (EGO) یعنی "خودی" کی طرف منعطف ہوتی ہے۔
اور یہی بات ان کی گمراہی کا باعث بن سکتی ہے۔

اہلِ قلم سہواً صدہا غلط الفاظ استعمال کرتے ہیں
کون ان کی طرف توجہ کرتا ہے؟ اور توجہ کرنی بھی نہیں
چاہیئے، لیکن جس غلط لفظ کے استعمال سے عقائد میں خلل
واقع ہونے کا احتمال ہو اس پر تبصرہ کرنا ہر مسلمان کا دینی
فرض ہے۔

اُردو لغت میں لفظ "خودی" مزموم معنیٰ میں مستعمل
ہے۔ اس لفظ سے خود پرستی، نخوت اور غرور کی بُو آتی ہے
دیکھئے نور اللغات، جو اردو کی مستند لغات سمجھی جاتی
ہے۔ جلد دوم صفحہ ۵۰۵ میں خودی کے معنی حسبِ ذیل
بتلائے گئے ہیں۔ خودی یعنی "انانیت خود پرستی، خود اختیاری،
خودسری، خودرائی، خود غرضی، غرور اور نخوت و تکبر۔"
اگر خودی کے اُردو میں یہی معنی ہیں تو میں ایسی خودی کا
سخت مخالف ہوں۔ اسلام ایسی خودی کو مٹانے آیا ہے،
بلند کرنے نہیں۔ نمرُود، شداد، فرعون، ہینی بال، چنگیز خاں
ابوجہل، نپولین، ہٹلر وغیرہم اسی نشۂ خودی سے سرشار
تھے جس کا مزہ وہ چکھ چکے ہیں۔

فارسی میں خودی کے کچھ اور ہی معنیٰ ہوتے ہیں۔
فارسی میں خودی "عزیز" یا "رشتہ دار" کو کہتے ہیں۔ مثلاً
او خودیٔ من است، یعنی وہ میرا رشتہ دار ہے، یا وہ میرا

اپنا ہے۔ دیکھئے الیس ہیم کی جدید
PERSIAN ENGLISH DICTIONARY۔ یہ ڈکشنری ایران
میں فارسی کی مستند لغت سمجھی جاتی ہے۔ اس میں خودی کے
معنیٰ حسبِ ذیل ہیں۔

خودی = 1. FAMILIAR; NEAR; RELATED

2. A RELATIVE; A KINSMAN.

اُردو اور فارسی کے ان معانی کے پیشِ نظر نفس
کی ترجمانی کے لئے لفظِ خودی قطعاً غیر موزوں اور نامناسب
ہے۔ قرآن کے کسی مترجم نے "نفس" کا مطلب "خودی"
نہیں بتایا۔

نفس ایک ایسا کلمہ ہے جس کا نہ عربی یا فارسی میں
ترجمہ ہو سکتا ہے نہ اُردو میں۔ یہ انسان کا جوہرِ اصلی ہے
جس کے لئے اللہ تعالےٰ نے نفس کا پیارا نام منتخب کیا ہے،
جس طرح "اللہ" خالقِ کونین کا ذاتی نام ہے صفاتی نام
نہیں، اسی طرح نفس انسان کے جوہرِ اصلی کا ذاتی نام ہے
اس کا ترجمہ ممکن نہیں۔

قرآنِ حکیم کا تربیت کردہ نفس کوئی اپاہج لنگڑا
لولہ نفس نہیں، جو بھبوت رما کر گوشہ نشینی اختیار کرے۔
یہ نفس ایک مومن، عابد، زاہد، عالم، مفکّر، فعال،
سیاست دان، شجاع، مجاہد اور معاً فقیرانہ نفس ہے۔ یہی
وہ قوی البنیان، عظیم المرتبت اسلامی نفس ہے، جو

خلفائے راشدین کے قلوب میں کارفرما تھا، جو حضرت
علی اسد اللہ، حضرت ابو عبیدہ بن جراح فاتحِ دمشق، حضرت خالد
بن ولید سیف اللہ، محمد بن قاسم فاتحِ سندھ، اور موسیٰ بن
نصیر فاتحِ اندلس کی شمشیروں میں چمکتا تھا، جس نے ایک
صدی کے قلیل عرصے میں، قیصر و کسریٰ کی عظیم الشان
سلطنتوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی، ایشیا افریقہ اور یورپ
کے وسیع خطوں سے کفر و الحاد کی جڑیں اکھاڑ دیں، اور انہیں
ایمان، تہذیب و تمدن کے نور سے منور کر دیا۔ یہی وہ نفس
ہے جس نے سائینس اور ٹیکنالوجی کی بنیادیں رکھیں، جن پر
آج یورپ اور امریکہ کے سائینسدانوں نے جدید سائینس کی
عمارتیں کھڑی کی ہیں اور ان پر ناز کر رہے ہیں۔ قرآنِ کریم
کے اس تربیت یافتہ نفس نے آٹھ سو سال تک یورپ، افریقہ
اور ایشیا کے بیشتر ممالک پر حکمرانی کی ہے۔

اس نفس نے ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک - بھارت
جنگ میں ہمارے مجاہدوں، غازیوں، اور شہیدوں کے
قلوب پر مسلط ہو کر شہادت، شجاعت، تدبیر و تدبر کے
وہ کارنامے انجام دیئے، جن کو دیکھ کر دنیا مبہوت ہوگئی، اور اب
دنیا متنبہ ہو چکی ہے کہ یہ اسلامی نفس ایسا ہی فعال اور شجاع ہے
جیسا وہ غزواتِ بدر و خندق میں تھا۔ حضرت علی، حضرت خالد بن
ولید، حضرت ابو عبیدہ بن جراح کی ارواحِ مقدسہ میجر راجہ عزیز بھٹی
شہید اور ہمارے دیگر مجاہدوں کے ایمان و عزم اور ایثار و شجاعت پر
آفرین کہتی ہوں گی۔

اس مومن، فعال نفس کے صفاتِ اختصاصی کا علم
حاصل کرنے کے لئے قرآن اور احادیث کے اوراقِ مقدسہ
کا مطالعہ اور ان پر عمل ضروری ہے۔ مسلمانوں کو اَلَّذِینَ
یُؤمِنُونَ بِالغَیبِ (جو غیب پر ایمان لائے ہیں)، کیا ضرورت
پیش آئی ہے، کہ وہ نیٹشے[۵۱] کے (SUPERMAN) یعنی "فوق البشر"
فیشٹے[۵۲] کی ایگو (EGO) یعنی "خودی" اور برگسان[۵۳] کے
(ELAN VITAL) یعنی مجاہدۂ حیات کی چھان بین کریں۔ ایسے
نفس کی تربیت، ہیگل، نیٹشے، فیشٹے اور برگساں کی بکواس
نہیں کرسکتی، اس کی تربیت قرآن اور احادیث کے اسباق
ہی کرسکتے ہیں۔

دینی اور روحانی مباحث میں فلسفیانہ افکار خلط ملط
کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ ایسا کرنے سے نہ دین کی خدمت
ہوسکتی ہے نہ فلسفے کی۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کا مقام
اور میدان جداگانہ ہے۔ دین کا تعلق عقائد سے ہے اور
فلسفہ کا افکار سے۔ ہر مفکر کے افکار اس کے ذاتی علم اور

---

۵۱ نیٹشے FREDERICH NIETZSCHE ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۰۰ء میں فوت ہوا

۵۲ فیشٹے JOHANN GOTTLIEB FICHTE ۱۷۶۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۱۴ء میں فوت ہوا۔

۵۳ برگسان HENRI BERGSON ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۴۱ء میں فوت ہوا۔

تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں ۔ چونکہ ایک شخص کا علم اور تجربہ دوسرے
شخص کے علم اور تجربہ سے مطابقت نہیں رکھتا ، اسی لئے
فلاسفہ کے افکار میں مضحکہ خیز اختلافات پائے جاتے ہیں جس
کا اندازہ ذیل کی نظم کے مطالعے سے ہوگا ۔ ان اٹکل باز
فلسفیوں کے پاس کوئی ذہنی پیمانہ ، معیار یا کسوٹی نہیں
ہوتی جس کی مدد سے وہ معلوم کر سکیں کہ ان کے افکار صحیح
ہیں یا غلط ۔ ان کا کام فکر کی دنیا میں قلابازیاں کھاتا اور اٹکل
لڑانا ہے ۔ قرآن کی متعدد آیات میں اٹکل بازوں کی سخت تحقیر
کی گئی ہے اور انہیں احمق قرار دیا گیا ہے ۔ داغ نے شاید
انہی اٹکل بازوں کے بارے میں کہا ہے ؎

پیمانہ کی حاجت نہیں مجھ تشنۂ مے کو
اے پیرِ مغاں تو مجھے اٹکل سے پلا دے

فلسفیانہ افکار کے اسی اُلجھاؤ سے تنگ آکر
امام غزالیؒ نے عالم روحانی کا حال معلوم کرنے کی غرض
سے ریاضت شروع کی ۔ ایک مدّت کی ریاضت کے بعد
ان پر جو روحانی کیفیات گزریں ، ان کا حال "اعترافات الغزالی"
کے مطالعے سے ہو سکتا ہے ۔ عقل اور حواسِ خمسہ کے
توسط کے بغیر دور دراز کی باتیں ، ان کے نفس کو معلوم
ہو جاتی تھیں ۔ آئندہ وقوع میں آنے والے واقعات
کا علم ، ان پر قبل از وقت منکشف ہو جاتا تھا ، امام مرحومؒ
نے "اعترافات" میں فرمایا ہے کہ میں نہیں بیان کر سکتا کہ

عالم روحانی کیا ہے اور اس میں کیا کیفیتیں گزرتی ہیں ۔ کسی
نے کیا خوب کہا ہے ؎

تو نہ دیدی گہے سلیمان را
تو چہ دانی زبانِ مرغاں را

عالمِ روحانی کے حالات معلوم کرنے کے لئے ایمان ، زہد و تقویٰ
اور ایک مدت تک سخت ریاضت کی ضرورت ہے ۔ فلاسفہ
ریاضت کے بغیر عالم روحانی کے حالات کیسے معلوم کر سکتے ہیں ؟

" ای راہ کہ تو می روی بہ ترکستاں است "

فلسفیوں کی نظر میں سوپر مین (SUPERMAN)
اوورمین (OVERMAN) یعنی فوق البشر کے صفاتِ اختصاصی
خواہ کچھ ہی ہوں ، لیکن قرآنِ حکیم کا بیان ہے —

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

اللہ تعالےٰ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز
اشخاص وہ ہیں جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہیں ۔
(دیکھئے سورہ ۴۹ الحجرات آیت ۱۳)

ہم مسلمانوں کے نزدیک رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم
ہی دنیا میں واحد سوپرمین (SUPERMAN) اور اُوورمین
(OVERMAN) یعنی انسان اعظم ، اور افضل البشر ہیں ۔
خداوندِ متعال نے خود اس کی شہادت دی ہے ۔ قرآن میں فرمایا ہے۔
لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ
یَرْجُوا اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا ۝

جن کی اللہ تعالیٰ سے اور یوم آخرت سے اُمیدیں وابستہ
ہیں ، اور جو کثرت سے اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں۔ ان کے
لئے رسولِ اکرمؐ کی ذاتِ بابرکات، انسان کا بہترین نمونہ ہے۔

(دیکھئے سورہ ۳۳ الاحزاب آیت ۲۱)

خداوند متعال نے نبی کریمؐ کی عظمت و منزلت ایک
انوکھے طریقے سے ذہن نشین کرائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ
کے صفات و کمالات طویل سورتوں میں نہیں بیان فرمائے، صرف
ایک ہی آیت میں ان کے مرتبے کا نقشہ کھینچا ہے۔ قرآنِ حکیم
کہتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝

(دیکھئے سورہ ۳۳ الاحزاب آیت ۵۶)

اس آیتِ مبارکہ کا ترجمہ نہیں بلکہ تفسیر یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے کہ اے میرے بندو! تم اس رسول اکرمؐ کی عظمت اور
منزلت کو کیا جانو۔ یہ وہ عظیم المرتبت نبی ہیں جن پر اللہ تعالےٰ
بذاتِ خود اور اس کے فرشتے درود و سلام بھیجتے ہیں۔ پس
اے بندو! غور کرو کہ اس نبی کا اللہ تعالےٰ کے نزدیک کیا رتبہ
ہے۔ اسی لئے تم پر واجب ہے کہ تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو
پس اوور مین (OUERMAN) ، سپر مین ۔
(SUPERMAN) فوق البشر، اعظم البشر، افضل انسان
صرف نبی کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ اُن کی

پیروی ہم پر لازم ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان کی تعلیم
کا غور سے مطالعہ کرے اور ہیگل، کانٹ، نیٹشے، فیشٹے اور برگسان
کی بے سروپا، بے معنی لایعنی بکواس کی طرف توجہ نہ کرے۔
علم کی بحث میں نفس کا ذکر آگیا تھا۔ میں نے
بیتاب ہو کر "نفس" اور "خودی" سے متعلق یہ باتیں، جو
ایک مدّت سے میرے دل میں کھٹک رہی تھیں، لکھ ڈالیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰینَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؕ

عِلم

عِلم! اے عِلم! ترا مدح سرا کون و مکاں
کیا وہ سرچشمہ ہے جس سے تو ہوا نور فشاں
تاب و طاقت ہے تری انجمِ گردوں سے عیاں
ہے تری اصل مگر غیب کے پردے میں نہاں

تو ہے وہ نور کا دریا نہیں جس کو ساحل
نہ خلا اور نہ ملا، راہ میں تیری حائل

دیکھ سکتی نہیں ہر آنکھ تجلّی تیری
آشنا تجھ سے ہر اک جاں ہے بقدرِ امکاں
تو ہے تعمیر میں خلّاقِ ازل کا معمار
تیری توقیر سے مسجودِ ملائک انساں
خاک کو تیرے توسط سے ملی فکر و نظر
تو ہے فطرت کا شجر، تیرا ثمر کون و مکاں
علم! اے علمِ بشر! گرمِ تگ و تاز ہے تو
کیا ہے تو! خالقِ کونین کا ہمراز ہے تو

النظریۃ العقلیہ

RATIONALISM

اس مذہبِ فلسفہ کے مبلّغین زمانۂ قدیم میں سقراط، افلاطون اور ارسطو تھے اور دورِ جدید میں ڈیکارٹس، اسپنوزا لائبنیز، ہیگل وغیرہ ہیں۔

لیلیٰ عقل کہ محمل میں بھی کرتی ہے حجاب
تجھ کو آغوش میں لینے کے لئے ہے بیتاب
ہم نے دیکھی نہ کبھی شکل و شباہت اس کی
جانتے ہیں کہ وہ بے کل ہے مثالِ سیماب
اس کی کاوش سے کھلے ہم پہ ہزاروں اسرار
وہ اٹھا سکتی ہے ہر راز کے چہرے سے نقاب
عالمِ قدس کا احوال بھی اس پر ہو عیاں
گر ہو حاصل اسے تائیدِ خدائے وہّاب
پیاس اس سوختہ جاں کی تری مے سے نہ بجھی
جتنی سیری ہوئی، اتنی ہی بڑھی تشنہ لبی

النظریۃ آلشکیہ

SCEPTICISM

اِس مذہبِ فلسفہ کے مبلّغینِ اوّلین یونانی سوفسطائی، پرڈاگورس اور گارجئس تھے۔ دورِ جدید میں اس کا عظیم موید ڈیوڈ ہیوم ہے۔

فلسفہ یہ بھی کبھی تو نے سُنا ہے کہ نہیں
آگہی جہل ہے اور جہلِ مرکّب ہے یقیں
کیا حقیقت میں یہ ہستی ہے کہ نیرنگِ خیال؟
بود و نابود کے اُلجھاؤ میں ہے جانِ حزیں
مخبرِ انساں کے ہیں آلاتِ حواسِ خمسہ
اعتماد ان پہ نہ کر، ہے یہی اپنی تلقیں
نوعیت ان کی ہو تبدیل، تو بدلیں افکار
جہل سمجھیں گے اسے، ہم جسے کہتے ہیں یقیں
خوردبیں جیسی ہوں آنکھیں تو نظر آئے ہمیں
ایک مکروہ شباہت میں جمالِ شیریں

لہ۔ اس مذہب فلسفہ کے مبلغین کہتے ہیں کہ حواس قابل اعتماد نہیں اور انسان کی عقل کچھ نہیں سمجھ سکتی۔ اس لئے کوئی علم قابل اعتماد نہیں۔

دید کی وضع جو بدلے، تو محبت بھی مٹے
عشقِ عاشق نہ رہے، گر نہ رہے حسنِ حسیں
غمزہ و نازِ زلیخا ہو، کہ حُسنِ یوسف
آلۂ دید کے کرتب کے سوا کچھ بھی نہیں
گوش بدلے، تو نہ ہو نُطق، نہ ہوں نغمہ نواز
چنگ و طاؤس کو دفنائیں گے ہم زیرِ زمیں
کس کو معلوم ہے ماہیّتِ فکر و اِدراک؟
دل کے کس گوشے میں ہے نفسِ جفاکار مکیں؟
ذہن سے کیسے ہیں مربوط حواسِ خمسہ؟
پوچھ تو ذہن سے خود ذہن کو معلوم نہیں
حافظہ چیز ہے کیا؟ علم کا مخزن ہے کہاں؟
پردۂ مغز میں حافظے کے کہاں ہے یا سیں؟
کس کو مشہود ہوئی، روحِ روانِ انساں؟
چشمِ بینا کو نظر آئے وہ اے کاش کہیں

کیسے الفاظ میں ہوتے ہیں مبدّل افکار؟

لاکھ سمجھائے کوئی، ہم کو نہ آئے گا یقیں

ہے بپا شورشِ جذبات خرد کیا جانے

کِشورِ دل پہ حکومت کے اُصول و آئیں!

کاش معلوم ہو اصلیّتِ خاک و افلاک

اِن کی تخلیق کی عِلّت بھی تو معلوم نہیں!

غالبِ پاک قلم، شاعرِ اعجاز رقم

مات و مبہوت ہے سن اُسکی نوائے رنگیں

"لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم

دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں!"

کوئی تحقیق نہیں شک و شبہ سے خالی

کوئی تصدیق نہیں جس سے ہو دل کو تسکیں

مفت میں عقل ہوئی لاف زنی سے مشہور

نہیں ایک بات بھی ناداں کو سمجھنے کا شعور!

النظریۃ التجربیہ

EMPIRICISM

اس مذہبِ فلسفہ کا مبلّغ عہدِ قدیم میں دیمقراطیس تھا اور دورِ جدید میں لاک، برکلے، اور ہیوم ہیں۔

ذہنِ انساں، جسے کہتے ہیں سبھی اپنا دماغ

صاف قرطاس کے مانند ہے، لوحِ بے داغ

چونکہ حسّاس و مفکّر نہیں، کیا علم اسے؟

کوئی حیوان شتر ہے، کہ ہے خچر، کہ اُلاغ!

وہ اُٹھاتا نہیں تدبیر و تدبّر کا عذاب

فکر اور ذکر سے خالی، اسے حاصل ہے فراغ!

علم و دانش کے محصِّل ہیں حقیقت میں حواس

لحظہ لحظہ، وہی ہر بات کا لیتے ہیں سراغ

وہ محافظ ہیں ہمارے ، ہے فریضہ ان کا

حفظِ جاں کے لئے ، ہر خطرے کا فوری ابلاغ

چاق چوبند، وہ ہر آن ہیں سرگرمِ عمل

باغبانی سے انہیں کی ، ہے ہرا ذہن کا باغ

ذہن پر ثبت وہ کرتے ہیں تجارب اپنے

جن کے انوار سے بنتا ہے دماغ اپنا چراغ

تجربے دیتے ہیں ، انساں کے مسائل کا جواب

روشنی اُن کی لگاتی ہے حقایق کا سراغ

لوحِ بے مایہ کے مانند ہے ذہنِ انساں

معتقد اس کے ہوں شرمندہ، اگر ہو عریاں!

---

۵ اس مذہبِ فلسفہ کے مبلّغین کا خیال ہے کہ حواس کے توسّط سے جو تجربے ہمیں حاصل ہوتے ہیں ان کے مجموعے کا نام علم ہے ۔

النظریۃ اللاادریۃ [1]

AGNOSTICISM

اِس مذہبِ فلسفہ کا عظیم مبلّغ کانٹ[2] ہے ۔

آدمی صدق[3] و حقیقت سے نہیں ہے آگاہ

علم و اِدراک پر اپنے ہی نہیں اُسکو یقیں

کیسے ہم جانیں کہ اپنا بھی ہے خالق کوئی؟

کس طرح مانیں کہ موجود ہے فردوسِ بریں

کس کو معلوم ہے کیفیّتِ نورِ باری

جس کی تعظیم میں عابد کی، زمیں پر ہے جبیں

کعبۂ دل میں وہ آتا ہے ! وہ کیوں آتا ہے ؟

رازِ سربستہ ہے ماہیّتِ ابلیسِ لعیں

غیر محدود حقیقت ہے ، تو محدود ہے عقل

کسی کشتی میں سمایا ہے سمندر بھی کہیں؟

فٹ نوٹ ۱ ، ۲ ، ۳ دیکھئے صفحہ پر

غیب کے راز ہیں اِدراک سے بالا لیکن
کیوں نہ انساں کو ہو قدرت کے مظاہر کا یقیں؟
کیسے قدرت کے مناظر سے چرائیں آنکھیں؟
ان کے انکار سے ہوگی نہ خِرد کی تحسیں
دیکھ انجم کی ضِیا ، دیکھ کواکِب کی جِلا
اپنے پرتو سے وہ کرتے ہیں فلک کی تزئیں
گو اُٹھاتی نہیں چہرے سے حقیقت کے نقاب
قدرت انساں سے چھپاتی نہیں اپنے آئیں
گردشِ شمس و قمر کے ہیں قوانین اٹل
جن کی پابندی سے ہے راحتِ مخلوقِ زمیں
ذہنِ انساں کے لئے ایک معمّہ ہے "وجود"[۱]
جانتا اور پرکھتا ہے وہ ہر شے کی "نمود"[۲]

---

[۱] وجود = EXISTENCE

[۲] نمود = PHENOMENON

بملاحظہ فٹ نوٹ صفحہ

[۱] نظریۂ لاادریہ کے مبلّغین کا خیال ہے کہ انسانی فکر محدود ہے، اور وہ کائنات کے تمام حقائق کو نہیں سمجھ سکتی۔ دورِ جدید میں اس نظریہ کے عظیم مبلّغ کانٹ کا خیال ہے کہ انسانی فکر کی رسائی محض PHENOMENA یعنی مجاز تک ہے۔ حقیقت اس کی فہم سے بالاتر ہے۔

[۲] جرمنی کا مایۂ ناز مفکر کانٹ کہتا ہے کہ خدا، نفس، سزا و جزا، ارادہ پر اختیار جیسے مسائل فہم کی رسائی سے بالاتر ہیں لیکن ان پر اعتقاد عملی زندگی کے لئے ناگزیر ہے۔

[۳] صِدق = TRUTH   حقیقت = REALITY

صدق:۔ فلسفہ کی اصطلاح میں صِدق کسی چیز یا امر کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ہے۔ بعض فلاسفہ کی رائے میں صِدق ایک ایسی قدرِ اعلیٰ ہے جس کے وجود سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا۔ صِدق سے ان فلاسفہ کی مراد صِدقِ مطلق ہے جو دائم اور قائم ہے اور جو ایک لحاظ سے حقیقت سے مختلف نہیں۔ ان معنی میں حُسنِ مطلق اور خیرِ اعلیٰ یا خیرِ مطلق بھی ایسی ہی اقدار ہیں۔ ان فلاسفہ کا خیال ہے کہ یہ تین اعلیٰ اقدار یعنی حُسن، خیر اور صِدق، حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں یا اس کے مُظہر ہیں۔ لیکن اس نظریہ پر بعض فلاسفہ کو اعتراض ہے۔ معترضین کا کہنا ہے کہ خیر، حسن اور صدق کا کوئی وجودِ مطلق نہیں۔ یہ درحقیقت اضافی ہیں۔

صدق کے وجودِ مطلق سے اگر انکار کیا جائے
تب بھی اس کی اضافی حیثیت فلاسفہ کے لئے ایک معمّہ
ہے ۔ جب ہم کسی قضیے کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ صحیح
ہے یا غلط ، تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی قضیے کے صحیح
یا غلط ہونے سے ہماری کیا مراد ہے ؟ وہ کونسی خصوصیت
ہے یا خصوصیات ہیں جو کسی قضیہ کو صحیح یا غلط بتاتی ہے
یا بتاتی ہیں ۔ اس سلسلے میں عموماً تین نظریات پیش کئے
جاتے ہیں ۔ وہ یہ ہیں :-

۱۔ صداقت کا نظریۂ مطابقت ۔

CORRESPONDENCE THEORY OF TRUTH

۲۔ صداقت کا نظریۂ ارتباط ۔

COHERENCE THEORY OF TRUTH

۳۔ نتائجی نظریۂ صداقت

PRAGMATIC THEORY OF TRUTH.

اسلام کے نظریات علم الیقین ، عین الیقین اور حق الیقین
کی تشریحات کے لئے کئی صفحات درکار ہیں ۔ دیکھئے سورہ ۵۶
الواقعہ آیت ۹۵ اور سورہ ۱۰۳ التکاثر آیت ۴ اور ۵

علم اور اسلام

اسلام کی نظر میں اللہ تعالےٰ علم کا سرچشمہ
ہے ۔ وہ حسب ضرورت انسان کو علم عطا فرماتا ہے ۔ انسان
کو نفس اور عقل کے ساتھ دنیا میں اس لئے بھیجا جاتا ہے
کہ وہ خیر و شر ، لطف و عیش ، رنج و غم ، اور درد و الم کا علم
حاصل کرے ، اور اس علم کی روشنی میں اپنے خالق اور
اور اس کے صفات کو پہچانے ، اور اپنے نفس کی تربیت
کرتا رہے ۔

لطف و عیش ، رنج و غم اور درد و الم کا
علم اس لئے ضروری ہے کہ انسان کو جنّت کے لطف و
عیش اور جہنم کے رنج و غم اور درد و الم کا تھوڑا بہت
اندازہ دنیا ہی میں ہو جائے ۔ یہ علم احساس سے تعلق
رکھتا ہے ۔ اگر انسان کو یہ علم نہ ہو تو انسان لکڑی یا پتّھر کی
طرح بے حِس بن کر دوسری دنیا میں چلا جائے ۔
چونکہ انسان اور اس کی نسل کو دنیا میں زندگی

گزارنی ہے، اس لئے وہ ان دنیاوی علوم کو سیکھے جو اس کی راحت، آسائش اور حفاظت کے لئے ضروری ہیں۔ دورِ حاضر میں لوگ اپنی آدھی عمر دنیاوی علوم کی تحصیل میں صرف کرتے ہیں جو عقبیٰ میں کچھ کام نہ آئے گا، نفس کی تعلیم و تربیت کی طرف ان کی مطلق توجہ نہیں۔

دنیاوی علوم کی تحصیل ضروری ہے، لیکن ان کی تحصیل کے ساتھ ساتھ نفس کی بھی تعلیم و تربیت لازمی ہے۔ نفس کی تعلیم و تربیت کے لئے کسی اسکول، کالج یا یونیورسٹی میں سر مارنے کی ضرورت نہیں، صرف ایمان، عقل اور عزم کی ضرورت ہے۔ نفس کی تربیت کا علم، انسان گھر بیٹھے چند ہفتوں یا مہینوں میں حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اس کی کاملِ تربیت کے لئے ایک طویل مدّت درکار ہے۔

اسلام نظریۂ تناسخ کو نہیں مانتا۔ اس نظریۂ کے مبلغین کہتے ہیں کہ نفس کو کامل بنانے کے لئے انسان مختلف اشکال میں بار بار دنیا میں لوٹ آئے گا۔ قرآنِ کریم کی تعلیم ہے کہ انسان دنیاوی موت کے بعد دوبارہ کبھی نہیں مرے گا۔ البتہ عقبےٰ میں پہنچنے کے بعد انسان کا نفس مدتِ مدید تک ارتقا کے مدارج طے کرتا جائے گا۔ دیکھئے سورہ ۸۴ آیت ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹،

فَلَآ أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝
وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ۝ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ ۝

"شام کی سُرخی کی قسم، رات کی قسم اور جن چیزوں کو وہ اُٹھاتی ہے اُن کی قسم، اور چاند کی قسم، جب وہ کامل ہو جائے کہ تم بتدریج ترقی کے منازل طے کرتے رہو گے"
(اور اعلیٰ مراتب حاصل کرو گے)

علم و دانش کے تو شعبے ہیں ہزاروں، لیکن
دو ہیں وہ جن کے اہم ہونے پہ ہے دین کا صاد
ایک وہ جس کے توسّط سے ہو امرارِ معاش
دوسرا جس کے توسّل سے ملے عیشِ معاد
اوّل الذکر کی محرومی سے دنیا غارت!
ثانی الذکر کی مجبوری سے عقبےٰ برباد!
چمنِ علمِ بشر کے ہیں ثمر رنگ برنگ
عیش و ایمان و عمل، رنج و خوشی، شرّ و فساد
راحتِ جاں کے لوازم ہیں، ادب، علم و ہنر
پاک دل، نیک عمل، صبر، اور اللہ کی یاد!

نوعِ انساں کا ہے دانشکدہ یہ شورستاں
اِسی مقصد سے ہے یہ سلسلۂ کون و فساد
غور کر اے دلِ ناداں کہ یہ دنیا کیا ہے
تیری تخلیق سے خلّاق کا منشا کیا ہے!

جہل

مذہب السلوکیہ — BEHAVIORISM

کرداریت نفسیات کا ایک مدرسۂ فکر ہے اس کا بانی بیسویں صدی کا مشہور عالمِ نفسیات واٹسن WATSON ہے۔ واٹسن ذہن، شعور، لاشعور تحت الشعور کا سرے سے منکر ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ انسان کا کردار تمام تر میکانیکی ہے۔ پس اس کی تشریح بھی میکانیکی اصولوں پر ہو سکتی ہے۔ واٹسن ذہن کے مختلف لوازمات مثلاً ارادہ۔ خواہش۔ جذبات۔ وغیرہ کو بے معنی سمجھتا ہے۔

قرآن حکیم میں جہل کے معنیٰ لاعلمی اور بے علمی ہی نہیں، بلکہ اکثر آیات میں یہ لفظ حماقت اور بے وقوفی کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن حکیم کی اصطلاح میں جاہل یعنی بے علم، احمق، بیوقوف۔ کلامِ پاک میں حکمت کو جہل کی ضد بتلایا گیا ہے۔ حکمت کا ذکر متعدد آیات میں ہے۔ اِن آیات میں رسولِ اکرمؐ کی دنیا میں بعثت کا مقصد، بنی نوعِ انسان کو علم و حکمت اور اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دینا بتلایا گیا ہے۔ ایک آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، کہ "حکمت اور اچھی نصیحت سے لوگوں کو اللہ کی طرف بلاؤ"۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

سورہ لقمان میں حکمت کا تفصیلی ذکر ہے۔
ایک جگہ ارشاد ہے۔ "جس کو حکمت دی گئی اس کو خیر کثیر دیا گیا"۔

مَنْ یُّؤْتَی الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا

اِن آیات میں لفظ حکمت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان، عملِ صالح، علم، خوش خلقی، عقلِ سلیم، تدبیر و تدبّر اور سیاست، حکمت کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اس کے برعکس جہل کو کفر و الحاد، فتنہ و فساد اور بے عملی کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ قرآن نے جہل کی تحقیر اور حکمت کی تعریف و توصیف کی ہے، اور کفر کو جہل کا مترادف قرار دیا ہے، اور کافروں کو "جاہلوں" کہا ہے۔

جہل، اے جہل! تو ہے مصدرِ آفاتِ جہاں
موجبِ رنج و مِحَن، موجدِ اسبابِ فساد!
محفلِ کون و مکاں میں ترے لاکھوں اوتار
تو ہے فرہاد کہیں، اور کہیں ہے شدّاد!
کاہلی، حرص و ہوس، غیظ و غضب، بغض و عناد
یہ عوامل ہیں ترے، جن سے ہے دنیا میں فساد

ہیں بہت تیرے شرور، اِن میں ہے مشہور غرور

شہرِ اکبر ترا، ہر دور میں کفر و الحاد!

باندھ کر علم کی دستارِ فضیلت تو نے

عہدِ حاضر میں کیا "ایٹمی بم" بھی ایجاد!

فرض و حق چھوڑ کے خطرے سے گریزِ بے جا

بزدلی[1] کی ہے روش، جہل ہے جس کی بُنیاد

ضعفِ اعصاب کے باعث ہو جو انساں خائف

وہ کرے اپنا علاج اور خدا سے فریاد

کفر اور شرک و معاصی سے ہیں آلامِ جہاں

فرض ہے ملّتِ اسلام کا، اِن سب سے جہاد

جہل جس میں نہیں، انساں وہ جہاں میں ہے کہاں

علم کی وجہ سے ہو گی نہ جہالت عریاں

---

[1] ہم سمجھتے ہیں کہ ضعفِ قلب و اعصاب بزدلی کا سبب ہوتا ہے لیکن بعض ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ بزدلی کی اصل وجہ جہل ہے۔ ثبوت یہ پیش کرتے ہیں کہ بچے اپنی جہالت کی وجہ سے بہت ڈرتے ہیں۔ بزدل انسان میں پہلے ہی سے احمقانہ تصورات موجود ہوتے ہیں جو خطرے کے موقع پہ اُبھر آتے ہیں اور اسے ڈراتے ہیں۔

فنّی اور فوجی تعلیم

اسلامی ملک و ملت اور اس کی ثقافت کی حفاظت و سلامتی کے لئے، دینی تعلیم کے ساتھ فوجی، سائنسی ٹیکنالوجی اور دیگر فنون عالیہ کی تعلیم ناگزیر ہے۔ اگر ان مادی علوم و فنون سے اسلامی مملکتیں بے بہرہ رہیں، تو وہ قومیں جو ان علوم و فنون سے آراستہ ہیں، ان پر اپنا تسلّط جماتی رہیں گی۔

نوجوانوں کو سکھا فنِّ نبرد و پیکار

خودکشی ان کی ہے بے تیغ و تبر جنگ و جہاد

آج ہے فنِّ اہم، فنِّ نبرد و تخریب

ضامنِ امن ہے، یہ مُوجدِ اسبابِ فساد

آج تخریب سے ہے صلحِ جہاں کی تعمیر

قابلِ قدر ہے ابلیسِ لعیں کی ایجاد!

عِلم و اخلاق و ہنر کی ہو وطن میں تدریس

کون انساں کا عجز، ان کے ہے دم سازو انیس

اولاد کی تعلیم و تربیت

ہر مسلمان کا دینی فرض ہے

ہر زمانے میں اللہ کی سرزمین پر صدہا بچے ابنِ سینا، ابنِ رشد، ابنِ خلدون، خالد بن ولید، نیوٹن ایڈیسن وغیرہم کا دل و دماغ لے کر آتے ہیں۔ لیکن تحصیلِ علم کے ذرایع اور ترقی کے وسائل سے محروم ہونے کی وجہ سے گمنامی کی زندگی بسر کر کے، اپنا نام و نشان چھوڑے بغیر دنیا سے رخصت ہوتے ہیں "گرے" نے ایک مرثیہ میں (ELEGY BY GRAY) کیا خوب کہا ہے۔

"بے شمار خوب صورت پھول دشت و صحرا میں کھل کر اپنی خوشبو ضائع کرتے ہیں اور بہت سے موتی قعرِ سمندر میں پڑے رہتے ہیں۔ جن کی آب و تاب سے دنیا بے خبر ہے۔

غالب مرحوم بھی اس حقیقت پر تأسف کرتے ہیں

ے "سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں"

پس والدین کا فرض ہے کہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کے لئے ذرائع بہم پہنچائیں۔ ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں کہ

بچوں کو سزائیں نہیں دینی چاہئیں۔ وعظ و نصیحت سے ان کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ بعض بچوں پر تنبیہہ کا برا اثر پڑتا ہے۔ یہ خیال ان بچوں کے متعلق صحیح ہے جو سلیم الطبع اور حساس ہوں۔ ایسے بچوں کو سزا اور سرزنش تو درکنار، سخت سست الفاظ بھی نہیں کہنے چاہئیں۔ لیکن بعض بچے فطرتاً ضدی اور سرکش ہوتے ہیں۔ پند و نصیحت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ سزا اور تنبیہہ کے بغیر ان کی اصلاح غیر ممکن ہے۔ اگر ان کی اصلاح ہو جائے۔ تو ایسے ہی بچے عقل سلیم حاصل کرنے کے بعد، بڑے بڑے کارنامے انجام دیتے ہیں۔

لہٰذا اگر بچے گمراہی کی طرف مائل ہوں، تو والدین کو مایوس ہو کر ان کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ نہیں بند کرنا چاہیے۔ باکمال انسان بڑی مشکل سے بنتا ہے ے

"دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہوتے تک"

زندگی ہیچ ہے انسان کی بے علم و ہنر
مفت ہیں ان کے بغیر اس کے طبیعی جوہر
نفس کو جس سے ضرر، علم وہ ہے جہلِ مبیں![1]
یہ کھلی بات سمجھ لے خردِ خامِ بشر

[1] (حدیث) اِنَّ مِنَ الْعِلْمِ جَهْلًا (ترجمہ) بلاشبہ بعض علم جہل ہوتا ہے۔ (جیسے جادو، شعبدہ بازی، رقص وغیرہ ۱۲)

بے سوادی[۱] کے عواقب پہ رہے تیری نظر

جہلِ بے دردِ پسر راہزنِ شانِ پدر

اپنے فرزند کو بالجبر سکھا علم و ہنر

ضربِ زرگر سے زرِ ناب بنے گا زیور!

حکمت و علم کی پہچان فقط فکر و نظر

ہیں یہی معرکۂ زیست میں شمشیر و سپر

قلب میں نور ہو، بازو میں ہو نیروئے عمل

چمنِ دانشِ انساں کے یہ شیریں ہیں ثمر

رونقِ زیست کا سرچشمہ ہنرمندی و فن

بل پہ روغن کے ہے ضو پاش چراغِ روشن

صوفیا کا نظریۂ علم

صوفیا کے نزدیک وہی علم صحیح معنی میں علم کہلانے کا مستحق ہے، جس کی بدولت انسان کا ایمان مضبوط ہو۔ آخرت کے

---

[۱] ان پڑھ ہونا۔

جزا اور سزا کا اسکو یقین ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ اور اسکے صفات کو پہچانے اپنی نفس کی شرارتوں سے آگاہ ہو، اور اُسے پاکیزہ بنائیے اور یہ علم صرف علمِ دین ہے۔

صوفیا کا قول ہے، "کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے خدا کو پہچانا۔ مادی علوم و فنون دنیا کے ساتھ فنا ہونے والے ہیں۔ کیا عقبیٰ میں اطبّا مطب کھولیں گے اور بیماروں کے لیئے نسخے لکھیں گے؟۔ کیا انجینئر پل تعمیر کریں گے اور ریلوے لائنیں بچھائیں گے؟ کیا وکلا مقدمات چلائیں گے؟۔ کیا سائینس اور ٹیکنالوجی کے ماہرین وہاں ایٹم بم اور بجلی گھر بنائیں گے۔؟ چند روزہ زندگی کے لیئے، ان علوم و فنون کی تحصیل میں، اپنی جان کھپانا حماقت ہے۔

ان کا خیال ہے، کہ کوئی شخص اپنے علم و عقل کی مدد سے، نفس کی تربیت کر کے اُسے کامل نہیں بنا سکتا۔ نفس کی رہبری کے لیئے ایک مرشدِ کامل کا ہونا ناگزیر ہے۔ کوئی شخص تنہائی میں ورزش کر کے پہلوان بن کر کسی کو نہیں پچھاڑ سکتا۔ اس کے لیئے لازمی ہے کہ وہ کسی اکھاڑے میں کامل پہلوان سے کشتی کا فن سیکھے۔ اگر جسمانی تربیت کا یہ حال ہے، تو روحانی تربیت بغیر مرشد کاملِ کے کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟

بہت سی اسلامی جماعتیں صوفیا کے اس

خیال کی تردید کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ مرشدِ کامل ہمیں مل چکا ہے۔ ہمارے مرشدِ کامل رسولِ اکرم ﷺ ہیں۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے، ہمارے لئے قرآنِ کریم اور احادیث نبوی کا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ نفس کی تربیت سے متعلق جملہ ہدایات ان میں موجود ہیں۔ ہمیں صرف ایمان صبر، عزم اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ ہمیں کسی مرشد کی ضرورت نہیں۔

صوفیا کا جواب ہے کہ فنِ کُشتی کے سارے داؤ پیچ کتابوں میں موجود ہیں۔ انہیں پڑھ کوئی شخص پہلوان بن کر اکھاڑے میں کیوں نہیں اُتر آتا۔ کتابیں پڑھ کر کشتی کے داؤ پیچ انسان نہیں سیکھ سکتا۔

"فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست"

اپنے ہی نفس کو جان، اور خدا کو پہچان

بس ہے تیرے لئے یہ علم فرید آزاد

اپنی ہی عقل سے لیتا ہے سبق تو دن رات

ہائے ! نادان کو ناداں نے بنایا اُستاد

ڈھونڈ ظلمت کدۂ دہر میں نورِ ایماں

اس کے پرتو میں نظر آئے تجھے سود و زیاں